فسانہ

اپنے
حُسن
کو
چار چاند
لگائیے
ہمیشہ سوم پراڈکٹس پرائیویٹ لمیٹڈ کلکتہ کے
للی جیولری
گولڈ پلیٹڈ
زیورات پہنیئے۔ یہ زیورات دلکشی میں کسی طرح بھی سونے
کے زیورات سے کم نہیں۔ لیکن قیمت میں گھڑائی سے بھی کم
ہیں۔ آپ کی سُندرتا کو نکھارنے کے لئے بہترین ہیں۔
تجارتی معلومات کیلئے: ایم۔ ایس۔ شرما اینڈ سنز ۲۴۰ پوسٹ آفس سٹریٹ صدر بازار دہلی ۶
GAYWAYS/SP/23

SAFI
صافی
سے
خون بھی صاف اور
جلد بھی صاف
ہمدرد
دہلی • کانپور • پٹنہ
GAYWAYS/H/575

GAYWAYS/H/575

صنم کدہ
کی
اوّلین پیش کش
بہو بیگم
ستارے
مینا کماری
اشوک کمار
پردیپ کمار
سرزمین اودھ کی حویلیوں کی
داستان جن کے دروازوں
پر کبھی ہاتھی جھومتے تھے اور
نوبت بجا کرتی تھی — لیکن
آج گردش زمانہ کے ہاتھوں
اُن کے در و دیوار مسمار ہو چکے
ہیں اور عظیم کھنڈروں سے
حسرت برس رہی ہے۔
ہدایت :- ایم صادق
نغمے :- ساحر
موسیقی :- روشن
کہانی :- جاں نثار اختر
عکاسی :- ثریان ایرانی
ایسٹ مین کلر میں

سفر میں
بڑا ہی
مزا آئیگا
چنیدہ طاقت سے بھرپور
اجزا سے بنائی ہوئی
جے۔ بی۔ منگھارام کی
مٹھائیاں اور بسکٹ آپکے
سفر میں بے حد دلکشی اور مزا پیدا کریں گے
جے۔ بی۔ منگھارام کے
بسکٹ
لگ بھگ سبھی
ریسٹورنٹ
اور کینٹین بیچتے ہیں
جے۔ بی۔
منگھارام اینڈ کمپنی
گوالیار، حیدرآباد
J.B.MANGHARAM'S
Salto
Biscuits

بہارِ نو
بہار نو ٹانک بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے
اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
انگوری
معدہ، جگر اور تمام اعضا رئیسہ اور گردوں کی کمزوری
کو دور کرتی ہے۔ انگوری میں انگور کے علاوہ اور
بہترین ادویات سے اس کی قوت میں اضافہ کیا گیا ہے
ہر موسم اور ہر عمر کے لئے مفید اور صحت بخش ہے
شربت
نزلہ
معمولی بخار۔ کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
فواکہین
تازہ پھلوں کے رس سے تیار
کی جاتی ہے۔ جس کے استعمال
سے معدہ، جگر اور گردوں
کا فعل بہت بہتر ہو جاتا ہے۔
اور اس میں قوت آجاتی ہے۔
صالح خون کی بہتر تولید میں اضافہ
کرتی ہے۔ دل کو قوت پہنچاتی ہے۔
ریاح کی تولید کو کم کرتی ہے اختلاجِ قلب
کی تکلیف اور خون کے دباؤ کی زیادتی کو
دور کرتی ہے۔
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ۔ یو۔پی

اِشاعت کا پہلا سال
شرح چندہ
سالانہ ۸ روپئے
ایک کاپی ۷۵ نئے پیسے
فسانہ
رہنما
بلونت سنگھ
مدیر
مسعود احمد
خوشنویس:-
سید احمد حسین
آرٹسٹ
پایاب
فسانہ میں شائع ہونے والے تمام ادبی یا نیم ادبی مواد میں نام مقام واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہوتے ہیں اور حقیقی افراد، مقامات واقعات یا اداروں سے ان کی کوئی مطابقت محض ایک اتفاقیہ ہے جس کے لئے ایڈیٹر، پبلشر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی،
طابع وناشر:- مسعود احمد
مطبوعہ:- اسرار کریمی پریس الٰہ آباد
ٹائٹل:- بھارگو پریس الٰہ آباد
دفتر فسانہ ۲۱۶- دائرہ شاہ اجمل- الٰہ آباد۳

اِس شمارے میں

ایک
بات
یاد
رکھیئے
کہ
نورانی تیل رجسٹرڈ
دورِ حاضر کی بہترین ایجاد ہے
جس کی ضرورت ہر وقت پڑتی ہے۔
درد۔ زخم۔ چوٹ کٹنے جلنے اور
طاقت کی مشہور دوا ہے
NOORANI
TEL
INDIAN
CHEMICAL Co.
انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یو۔پی
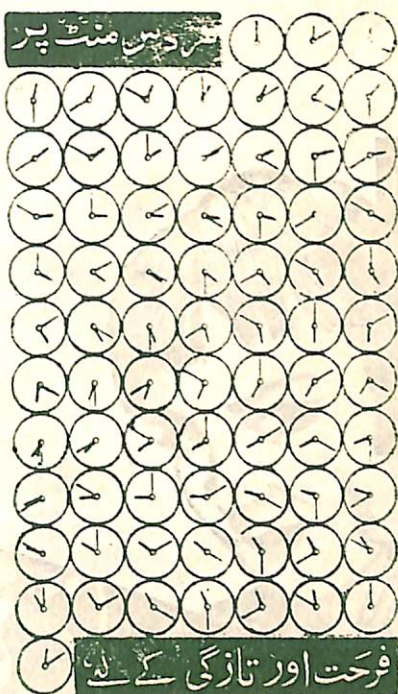
ہر دس منٹ پر
فرحت اور تازگی کے لئے
چیتا فائٹ
بیڑی
پیجیے
H. L. M. BIRI WORKS
حاجی لعل محمد بیڑی ورکس، میر گنج الہ آباد

"فسانہ" کا خیر مقدم ادبی حلقوں میں جس گرم جوشی سے ہوا وہ ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ قارئین کے تعریفی خطوط برابر آ رہے ہیں اور انھوں نے "فسانہ" سے جو توقعات قائم کی ہیں، ہم کوشش کریں گے کہ اُنھیں پورا کریں۔

اس شمارے میں تمام کہانیاں معرکتہ الآرا ہیں۔ جناب اوپیندر ناتھ اشک کا افسانہ "پلنگ" ایک نہایت نازک نفسیاتی افسانہ ہے۔ جسے پڑھ کر آپ یقیناً خوش ہوں گے اشک صاحب کے متعلق یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ وہ اب ہندی کے ہو کر رہ گئے ہیں لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اشک صاحب آج بھی اردو سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں اور اکثر اردو میں لکھتے رہتے ہیں۔

دیگر افسانوں کے متعلق اپنی طرف سے لکھنے کے بجائے ہم یہی عرض کریں گے کہ آپ خود مطالعہ فرمائیں اور پھر آپ یقیناً ہمارے انتخاب کی داد دیں گے۔

ادارِیہ

بھینی اور لطیف خوشبو کیلئے

حافظ محمدؐ زکریا اینڈ برادرس کا

عطر مجموعہ

استعمال کیجئے

ہمارے کارخانے کی مصنوعات

عطر تسنیم

اوٹو بہار

اوٹو گلدستہ

اوٹو من بہار

اوٹو باغ بہار

نقالوں سے ہوشیار رہئے

اور — ہمارا — نمبر ۳۹۱۸ — دیکھ کر — اُس کی — مہر بند — شیشیاں ہی خریدیئے

حافظ محمد زکریا اینڈ برادرس پرفیومرس نمبر ۲۹۹ سندھرسٹ روڈ ایسٹ بمبئی ۳

اوپیندر ناتھ ۔ اَشک

اردو کہانی

دلہن کی آنکھوں پر جھکی ہوئی کیشی کی نگاہیں اچانک پلنگ کے سرہانے گول شیشہ میں لگی اپنی ماں کی چھوٹی سی تصویر پر چلی گئیں ۔ حسین ، کتابی چہرہ ، بڑی بڑی آنکھیں ، غلافی پلکیں ، پتلی نازک ناک ، ترشے ہوئے ہنستے ہونٹوں میں موتیوں کی قطار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اچانک دلہن کے چہرے پر کیشی کی اپنی ماں کے خطوط ابھر آئے ... دونوں کے قد و قامت ، ناک نقشہ میں کتنی مشابہت تھی .... کیشتی کا ذہن دھندلا گیا ۔ ایک کپکپی اس کی رگوں میں دوڑتی چلی گئی سر کو ذرا سا جھٹکا دے کر اس نے اس تصویر کو نگاہوں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی ۔ لیکن بچپن سے لیکر ابھی کچھ ہی سال پہلے تک وہ نہ جانے کتنی ہی بار اسی طرح ماں کے سینے پر لیٹا تھا ..... اور وہ یاد اس لمحہ اس کے ذہن کے پردے سے ہو کر نکل گئی اور اپنی دلہن کی پھیلی پھیلی مخمور آنکھیں اور گیلے ، رسیلے ہونٹ چومنے کے بدلے وہ اچانک بائیں جانب کو پھسل پڑا ۔ چت لیٹ گیا ۔ پل بھر کو اسکی نگاہیں مسہری کے خالی فریم پر چھائے موتیا کے لمبے ہاروں پر چلی گئیں ۔ اس کا ہاتھ سیج پر بکھری بیلے کی کلیوں پر جا پڑا اور اس کے جی میں آئی کہ وہ اچھل کر اُٹھے اور اس معطر و معنبر حجلۂ عروسی سے باہر نکل جائے ۔

لیکن وہ نہ اچھلا ، نہ اُٹھا ، چپ چاپ لیٹا رہا ۔ دلہن نہ جانے ..... کیا سمجھے ، یہی خیال لاشعور میں اسے پلنگ سے باندھے رہا ۔ سر کو جھٹکا دے کر اس نے لمحہ بھر پہلے کی تصویر کو نظروں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی ۔ لیکن ایک کے بدلے کتنی ہی تصویریں ایک دوسرے کے اوپر برساتی بادلوں سی امنڈ پڑیں ۔

.... اسی کمرہ میں، اسی پلنگ پر اس کے پاپا اور ممی ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ برآمدے میں پلنگڑی پر وہ پڑا ہے اور ایک ٹک انھیں تک رہا ہے۔ پاپا کے ساتھ لیٹی ماں کتنی چھوٹی، کتنی حسین لگتی ہے۔

.... ماں آئینہ کے سامنے بیٹھی سنگار کر رہی ہے، اور وہ دروازہ کے پیچھے کھڑا چپ چاپ اسے دیکھ رہا ہے۔ آیا جس پری کی کہانی سُنایا کرتی تھی۔ ویسی ہی حسین تو اس کی ماں ہے۔ وہ اسے دیکھ لیتی ہے اور پیار سے بلاتی ہے۔ زمین پر گھٹنے ٹیک کر خوشی سے وہ اس کی گود میں سر چھپا لیتا ہے۔ ماں ایک ہاتھ سے اس کے بال سہلاتی ہے۔ دوسرے سے اپنے بالوں میں کنگھی کئے جاتی ہے۔

.... جانے پاپا کو کیا ہو گیا ہے؟ ایک آدمی روز آتا ہے، اس کے گلے میں دو سانپ سے لٹک رہے ہیں۔ ان کا ایک ایک سر دونوں کانوں میں لگا کر ان کا منہ وہ پاپا کی چھاتی پر جہاں تہاں رکھتا ہے۔ پھر ان کے بازو میں سوئیاں چبھوتا ہے۔ پاپا نہیں روتے، پر وہ رونے لگتا ہے۔ ممی اسے چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔

...... پاپا زمیں پر لیٹے ہیں۔ ہلتے ڈولتے نہیں۔ گھر میں سب رو رہے ہیں۔ وہ بھی روتا ہے۔ روئے جاتا ہے۔ ماں روئے جاتی ہے۔ اسے چپ ہے جاتی ہے، روئے جاتی ہے۔ عورتیں اس کی چوڑیاں توڑ دیتی ہیں۔ اس کے ماتھے کا سیندور پونچھ دیتی ہیں۔ کیتنی کو اس کی گود سے چھین لیتی ہیں۔ وہ روتا ہے۔ روئے جاتا ہے مگر اسے کوئی چپ نہیں کراتا۔

.... وہی پلنگ ہے۔ وہ اپنے پاپا کی جگہ لیٹا ہے۔ ماں اس کے ساتھ لیٹی ہے۔ ایک سادہ سی سفید دھوتی پہنے ہے۔ صبح کا اجالا کمرہ میں جھانک رہا ہے لیکن ماں بے سُدھ سوئی ہے۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھا رہتا ہے...... پتلا نازک پریوں کا سا چہرہ، بند آنکھیں، کھلے بکھرے بال ...... وہ اسے اُس شہزادی سی لگتی ہے جو سحر زدہ ہوئی تھی اور جسے شہزادے نے آکر جگایا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور اسے کِسّی (KISSY) کر لیتا ہے۔ اس کی ماں جگ جاتی ہے۔ باہیں پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتی ہے اور اس کی پیشانی، آنکھیں اور اس کے ہونٹ چوم لیتی ہے۔

وہ اپنی ماں کے سینہ پر لیٹا ہے۔ وہ اسے شہزادے کی کہانی سُنا رہی ہے جو سات سمندر پار سے شاہزادی بیاہ لایا تھا۔ کہانی سُنا کر وہ اس سے پوچھتی ہے "کیا تو بھی ایسی شاہزادی سے شادی کرے گا؟"

"میں تم سے بیاہ کروں گا۔"

"دھت پگلے! کبھی بیٹے بھی ماؤں سے بیاہ کرتے ہیں؟"

اور وہ اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی ہی جیسی دلہن بیاہ کر لائے گی۔

"میں پھر یہی پلنگ لوں گا۔" وہ پلنگ کے سرہانے لگی اپنے ماں کی حسین تصویر کو دیکھ کر ٹھنکتا ہے۔

"ہاں۔ ہاں، یہ پلنگ میں تمہیں اور تمہاری دلہن کو دوں گی۔"

اور وہ اسے سینے سے لگاکر بھینچ لیتی ہے۔

"کیا بات ہے۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے؟" اچانک دلہن کہنی کے بل ہوکر اس کی پیشانی اور بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ہے۔

"نہیں کچھ نہیں!" سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے یادوں کو پرے ہٹاتا ہوا کیشی ہنستا ہے۔ ایک ایسی ہنسی، جو لمبی سانس جیسی معلوم ہوتی ہے۔

اس کی ماں نے تو سچ ہی کہا تھا۔ ویسا ہی بوٹا سا قد، حسین چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، تیکھے نقش، نازک ہونٹ، موتیوں جیسے دانت — ماں واقعی اسکی دلہن ہو بہو اپنے ہی جیسی لائی تھی اور حالانکہ جہیز میں بڑا خوبصورت پلنگ آیا تھا۔ مگر ماں نے برسوں پہلے کے اپنے وعدہ کے مطابق، وہی اپنا والا، بڑا سا قیمتی پلنگ حجلۂ عروسی میں بچھوایا تھا۔ پلنگ کیا، اپنا کمرہ ہی دلہن کو دے دیا تھا۔

دلہن اس پر جھکی اس کی آنکھوں میں کہیں دور جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جاننا چاہتی تھی کہ کچھ لمحہ قبل اس کا جوش و خروش یکدم سرد کیوں پڑ گیا؟ لیکن یہ جاننے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا اور نہایت حجاب آمیز پیار سے وہ اس پر تھوڑا جھکی اُس کے بال سہلائے جا رہی تھی۔

کیشی چند لمحے چپ چاپ لیٹا رہا۔ پھر اچانک اُس نے دلہن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس کے سر کو اپنے سینے پر رکھے اس کے بالوں، گالوں اور ہونٹوں کو سہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے دماغ سے تمام جالے دور ہو گئے۔ اور سینے پر لیٹی دلہن اور اس کے گورے گداز جسم کی گرمی اس کے رگ و ریشے میں سما گئی۔ اس نے آہستہ سے اُسے چوم کر اپنے پہلو میں لٹا لیا اور اس کے گرم گداز سینہ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ بار بار اس کا جی چاہتا کہ وہ سر اُٹھائے، اپنی بیوی کو پیار کرے لیکن جیسے اس تصویر کا سامنا کرنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ ..... وہیں لیٹے لیٹے، بائیں ہاتھ سے اُس نے اپنا تکیہ اٹھا کر اندازے سے تصویر کے آگے رکھ دیا۔ پھر اس نے سر اُٹھایا لیکن وہ تصویر گویا اس تکیے کے پیچھے چھپ کر اور بھی نمایاں ہو گئی تھی اور دلہن کے چہرے پر کسی دوسرے چہرے کے خطوط بننے لگے تھے..... نہیں..... نہیں..... نہیں! وہ جھنجلا کر دل ہی دل میں چلایا، اور پھر پھسل کر ویسے ہی چت لیٹ گیا۔ پھر نہ جانے کیسا بگولہ سا اس کے دل میں اُٹھا کہ وہ اچھلا اور حجلۂ عروسی سے باہر نکل گیا۔

برآمدے کی جھلملی سے چھت کی چاندنی بڑی شرمائی نگاہوں سے اندر جھانک رہی تھی۔ لمحہ بھر کو وہ برآمدے کی محراب میں رکا۔ چپ چاپ باہر پھیلی چاندنی میں تکتا رہا۔ ٹھنڈی ہوا کے لمس سے اس کے تنے ہوئے اعصاب کو کچھ عجیب سی راحت کا احساس ہوا لیکن وہ پلٹا نہیں بلکہ باہر نکل آیا۔ دائیں طرف پھولوں کی روشوں میں فلاکز اور بینا کھلے تھے۔ سامنے ڈیلیا کے پودے پھولوں کے بار سے جھکے، ہلکی ہوا کے جھونکوں سے جھول رہے تھے۔ گھاس کے لان کے ساتھ کٹی چھنٹی مہندی کے پیچھے کیاری میں سوسن کھلا تھا اور گلاب کی بیل کے گرد گول تھالے میں [illegible] ریشم کے ڈھیروں پھول گویا اس چاندنی میں نہا رہے تھے۔

—— کیشی ان راستوں میں اٹکتا بھٹکتا، پھولوں کے رنگوں کو جھک کر دیکھتا، بے خیالی میں انھیں چھوتا، بڑھتا چلا گیا۔ سورج کی تیز روشنی میں جو پھول اپنی رنگینی سے آنکھوں کو چوندھیا دیتے تھے وہ اس خنک چاندنی میں بہت ہی دلکش، پرسکون اور فرحت بخش معلوم ہوتے تھے۔ پیلا اور گلابی رنگ سفید سفید نظر آتا تھا اور گہرا سرخ، نیلا یا جامنی سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ کالج کی چہار دیواری کے پاس پہنچ کر وہاں رکا جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ آغاز بہار کا بیلا کھلا تھا۔ چہار دیواری کے نیم تاریک سائے میں بیلے کے پھول موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ پہلے کبھی جب چاندنی راتوں میں وہ بیلا کھلا دیکھتا تھا تو ہمیشہ کہیں پڑھے یا سنے گیت کی ایک لائن اس کے ہونٹوں پر مچل جاتی تھی اور وہ بے اختیار ہو کر گنگنا اٹھتا تھا۔

بہت دنوں کے بعد کھلا بیلا، میرا آنگن مہکا

آنگن مہکا

لیکن آج جب سچ مچ اس کا آنگن مہکا تھا تو وہ گیت نہ جانے ذہن کے کس تاریک گوشے میں کھو گیا تھا اپنے تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ کالج سے گیٹ تک اور گیٹ سے کالج تک چپ چاپ گھومتا رہا۔ پھر جب وہ دوسری بار گیٹ سے واپس آ رہا تھا تو اس کی نظر کالج کے دوسرے کنارے والے کمرے کے شیشے پر گئی۔ اندر روشنی تھی۔ اس کی ماں یقیناً جاگ رہی تھی۔ اس کی انٹی اور دوسری عورتیں بھی جاگ رہی تھیں اور ...... شاید انھیں کے بارے میں سوچ رہی تھیں ...... اس کی ماں نے کتنی محنت اور شوق سے اس کا حجلۂ عروسی سجایا تھا۔ سارا دن کنارے والے کھانے کے کمرے میں (جس کی میز کرسیاں باہر برآمدے میں کھڑی کی گئی تھیں اور جس میں بہو کو اتارا گیا تھا۔) ماں، انٹی اور دوسری عورتیں گنگنا، گتھلی، مانگ بھرائی اور منہ دکھائی کی رسمیں پوری کرتی رہی تھیں۔ ساتھ کے ڈرائنگ روم میں وہ اپنے دوستوں میں گھرا بیٹھا رہا تھا۔ برابر کے اس کے اپنے کمرے میں دنیا جہان کے سامان میں جہیز کا سارا سامان اور فرنیچر بھی رکھا جاتا رہا تھا اور ادھر کے ماں والے کمرے کو سہاگ رات کے لئے سجایا جاتا رہا تھا۔ دسیوں رسموں، مہمانوں کی آؤبھگت اور دوسرے بیسوں کاموں میں الجھی اور کئی راتوں کی جاگی اپنی ماں کو اس نے بارہا اس کمرے میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ انٹی اور دوسرے رشتے کی اس کی ایک جوان خالہ اس کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ ماں کی خوشی کی انتہا نہ تھی گویا اتنے رت جگوں، اتنی دوڑ دھوپ، اتنی جانفشانی اور اتنے ہنگاموں کا ماحصل بس اسی کمرے کی آرائش و زیبائش تھی۔ وہ کئی بار بہانے سے آیا تھا کہ آخر وہ بھی تو دیکھے اس کی ماں اور انٹی وہاں کیا سجاوٹ کر رہی ہیں۔ لیکن ہر بار اسے بھگا دیا گیا تھا۔ رات سے پہلے اسے ادھر جھانکنے کی اجازت نہ تھی۔

دوستوں سے باتیں کرتے ——، رسموں میں شامل ہوتے اور عورتوں کے مذاق سنتے ہوئے کیشی کی نظریں بار بار اپنی ماں کے چہرے پر جا ٹکتی تھیں۔ اگرچہ اس کی عمر اب چالیس کی ہونے کو آئی تھی اور بائیس برس کی طویل بیوگی نے کچھ عجیب سی سختی اس کے چہرے پر پیدا کر دی تھی اور اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سیاہ گڑھے بن گئے تھے لیکن سفید سلک کی ساڑی میں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی خوشی سے تمتمایا اس کا چہرہ کیشی کو تمام دوسری عورتوں سے زیادہ حسین نظر آ رہا تھا اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے نہ جانے کس جادو کے زیر اثر غائب ہو گئے تھے رسمیں

ادا کرتی اور مہمانوں کا خیال رکھتی ہوئی اس کی ماں وقت نکال کر حجلۂ عروسی کو سجانے میں لگ جاتی، تھکان کا اس کے چہرے پر کہیں نشان تک نہ تھا۔

وہ جانتا تھا اتنی تھکان اور شب بیداریوں کے باعث ماں بیمار پڑ جائے گی۔ ان دنوں وہ ہر رات سونے سے پہلے ماں کے پاس جاکر اس سے کہتا تھا "ماں اب سو جاؤ"

..... لیکن خود سونے کے بجائے ماں آ سے اس کی چارپائی پر لے جاکر ہلکا سا تیل اس کی کنپٹیوں پر ملتی اس کی بھوؤں کو سہلاتی اور اسے سلا کر خود کام میں جا لگتی۔ کیشی کو بہت پہلے سر میں تیل ڈلوانے کی عادت پڑ گئی تھی امتحان کے دنوں میں جب وہ رات رات بھر پڑھتا تھا اور دن کو ایک آدھ گھنٹہ سونا چاہتا تھا اور اسے نیند نہ آتی تھی تو ماں اس کے سر میں تیل لگاتی تھی اور اس وقت کیشی اپنے سر پر جھکے اس کے چہرہ کو ایک ٹک دیکھتا رہتا اور سوتا نہ تھا۔ تب ماں پیار سے اس کی آنکھیں بند کر دیتی تھی انھیں آہستہ سے چوم کر اس کی بھوؤں پر اپنی ڈھیلی انگلیاں یوں جلدی جلدی چلاتی تھی اور اتنا پیار ان نرم انگلیوں میں بھر دیتی تھی کہ اس کی پلکیں بھاری ہو جاتی تھیں اور وہ گہری نیند سو جاتا تھا۔ کیشی نے خود بھی یہ فن اس سے سیکھ لیا تھا۔ کبھی جب تھکان یا فکر سے ماں کو نیند نہ آتی تھی تو وہ خود اس کے سرہانے بیٹھ کر بڑے ہی پیار سے اس کی کنپٹیاں سہلا کر اسے سلا دیتا تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا، تیرہ چودہ برس کا۔ تو ایسے میں ماں کبھی کبھی اس کا سر جھکا کر اسے چوم لیتی تھی۔ جب وہ بڑا ہو گیا۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے کر کے یونیورسٹی میں نفسیات کا پروفیسر ہو گیا تو ماں ایسے موقعوں پر صرف اس کی پیشانی چومتی تھی اور کیشی بڑے پیار سے اسے تھپتھپا کر سلا دیتا تھا۔ وہ چاہتا تھا ـــــ شادی میں آئی ہوئی عورتوں میں گھری اپنی ماں کو اٹھائے اور اسے اس کے کمرے میں لے جا کر گہری نیند سلا دے۔ لیکن وہاں تو وہ سہاگ سیج سجانے میں لگی تھی۔ پھولوں کی کمی کی وجہ سے نہ جانے اس نے کتنے آدمیوں کو کہاں کہاں بھیجا تھا اور کتنا پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا ـــــ ماں! تم کیوں جان ہلکان کر رہی ہو۔ تمہارا پیار ان ساری رسموں، خوشیوں، آرائش و زیبائش سے بڑا ہے۔ میرے لئے اس کا مول ان سب سے کہیں زیادہ ہے۔ تم بیمار پڑ جاؤ گی، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس کی ایک نہ سنے گی۔

"میری شادی تو بیٹے کچھ یوں ہی ہوئی تھی" اس نے کیشی سے ایک بار کہا تھا "تمہارے پاپا معمولی کلرک تھے اور کمپٹیشن میں ابھی بیٹھے نہ تھے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری بہو کے دل میں کوئی تمنا رہ جائے۔ پھولوں کا ایک گجرا تک نہ آیا تھا میرے لئے۔ تم ذرا دیکھنا! تمہاری دلہن کی سیج میں کیسے سجاتی ہوں"

اور جب حجلۂ عروسی کا پردہ اٹھا کر اسے اندر دھکیلتی اور

"دیکھو فلاسفی ہی نہ بگھارتے رہنا" کہتی اور ہنستی ہوئی اس کی جوان خالہ چلی گئی تھی تو کیشی لمحہ بھر کو حیران سا کھڑا رہ گیا تھا۔ کمرہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ پلنگ اور دوسرا ساز و سامان بھی اس کا جانا پہچانا تھا۔ ماں نے اپنا ڈریسنگ ٹیبل، اپنا سنگھار دان، پیپر مینشی کا چوڑی بکس، بمبئی سے منگایا ہوا اپنا قیمتی ٹیبل لیمپ ـــــ سب کمرہ میں کچھ اس ڈھنگ سے سجا رکھا تھا کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ نمایاں نظر آتی تھی۔ لیکن جس چیز نے کمرے کو سب سے زیادہ حسین بنا

دیا تھا وہ تھے آغازِ بہار کے موتیے کے پھول۔ پلنگ پر مچھر دانی نہ تھی، اس کے فریم پر چھائے ہوئے موتیوں کے لمبے ہار دونوں جانب نیچے تک یوں لٹک رہے تھے کہ پھولوں کی مسہری سی بن گئی تھی۔ پلنگ پر بیلے کے پھولوں کی موٹی چادر بچھی تھی جس پر دلہن پھولوں کی دیوی بنی، ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔

پل بھر کے لئے کیشی کی نگاہوں کے سامنے اس کی ماں کی شادی کا منظر گھوم گیا۔ محکمۂ انہار کے ایک معمولی کلرک کی دلہن چھوٹی سی کوٹھری، معمولی چارپائی، لالٹین کی مدھم روشنی اور آسمانوں کو چھوتی ہوئی آرزوئیں۔! .... اس کے پاپا بعد میں ایگزیکیٹو انجینیر ہو گئے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ رہی تھی۔ لیکن ماں اس یاس و محرومی کو کبھی فراموش نہ کر سکی تھی۔ اپنے بیٹے کے حجلۂ عروسی کو اپنی مرضی کے مطابق سجا کر اس نے اپنی تشنہ خواہشوں کی تکمیل کر لی تھی لیکن وہی سجاوٹ کیشی کے لئے وبالِ جان ہو گئی تھی ــــــ جدھر بھی اس کی نگاہ جاتی، وہی مناظر اس کی آنکھوں میں ابھر آتے!

"دیکھنا فلاسفی ہی نہ بگھارتے رہنا۔" اچانک کیشی کے ذہن میں خالہ کا جملہ اور ہنسی گونج اٹھی۔ .... تو کیا وہ اپنے ہی جال میں پھنسا ہے؟ اس کی دلہن نہ جانے کیا سوچتی ہوگی۔؟ اس کے سامنے کئی واقعات گھوم گئے۔ جن میں پہلی رات مرد کی کمزوری دولہا، دلہن کی ازدواجی زندگی کو لے ڈوبی ...... لیکن پہلی ہی رات مرد کے لئے اپنے کو مرد ثابت کرنا کیا ضروری ہے۔؟ یہ عورتیں اس کے لئے کیوں اتنا تردد کرتی ہیں۔ کیا یہ سب کی سب دوسروں کے حجلۂ عروسی کو سجانے میں اپنی اپنی سہاگ رات کا لطف پھر نہیں حاصل کرتیں۔؟ تو کیا اس کی ماں بھی ...... اس کے حجلۂ عروسی کو سجانے میں اتنی محنت کرنا۔ اپنا پلنگ وہاں رکھ دینا .... اسے پھولوں سے ویسے سجا دینا، جیسا کہ اس کے دل میں اپنے حجلۂ عروسی کو سجا ہوا دیکھنے کی تمنا تھی اور اس کے پاپا کی غربت اور بے دلی کی وجہ سے جو پوری نہ ہوئی تھی، کیشی نے سر کو جھٹکا دیا، اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے کیوں کہا تھا، میں یہی پلنگ لوں گا؟ لیکن وہ تو بچہ تھا، کیا اس کی ماں بھی بچہ تھی؟ ....

وہ واپس برآمدے میں آ گیا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا، دلہن محراب کے نیچے کھڑی ہے۔

"طبیعت کچھ خراب ہے جی؟"

"نہیں!"

"کیا مجھ سے کچھ قصور ہو گیا؟"

کیشی کا جی چاہا زور سے قہقہہ لگائے ایک ہی بات اس کی دلہن کے دماغ میں بھی چکر لگا رہی ہے۔ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ اسے اندر لے گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنے ذہنی انتشار کو جھٹک کر وہی کرے گا جس کی سب توقع رکھتے ہیں۔ اس نے دلہن کو تھوڑی سختی سے چا۔پائی پر لٹا دیا۔ جھٹکے سے اس کے بلاؤز کے بٹن کھول دیئے۔ وہ اس پر جھکا۔ لیکن دلہن نے تکیہ کو پھر اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ کیشی کی نظر پھر اپنی ماں کی تصویر پر گئی۔ اس کا دماغ پھر دھندلا گیا۔ وہ اٹھا.... باہر جانے لگا تھا کہ دلہن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا بات ہے جی؟"

کیشی کی نظر درمیانی دروازہ کی طرف گئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ماں نے اپنے اس کمرہ میں اس کی سہاگ رات کا اہتمام

کرنے کی بجائے اس کے اپنے کمرہ میں وہ سب انتظام کیا ہوتا۔ لیکن اب تو اس کا کمرہ جہیز میں آئے ہوئے فرنیچر اور دوسرے سازوسامان کا گودام بنا ہوا تھا اور اس کی چابی بھی اس کے پاس نہ تھی۔

نہایت مجبوری سے اس نے باہر برآمدے کی طرف دیکھا۔ چاندی اب بھی بدستور جھلملی سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اچانک اُس نے کہا۔

"دیکھو نا۔ کیسی چاندنی کھلی ہے۔ آؤ ذرا باہر گھومیں!"

دلہن اُٹھی۔ اس نے اپنے بے ترتیب لباس کو درست کیا، ایک نگاہ غلط انداز آئینہ میں ڈالی، بالوں کی دو ایک لٹوں کو ٹھیک کیا اور ذرا سا گھونگھٹ کاڑھ کر، کیشی کے پیچھے ہولی۔

وہ باز آمدے سے گیٹ تک اور گیٹ سے برآمدے تک چپ چاپ کیشی آیا ___ دلہن نے ایک دو بار چاندنی کی تعریف میں ایک آدھ جملہ کہا، لیکن کیشی کو خاموش دیکھ کر وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ٹہلتی رہی۔

اپریل کی چاندنی غیر مرئی شراب کی مانند ان کی رگ رگ میں سما رہی تھی لیکن وہ دونوں اس کی جانب سے بے نیاز تھے۔ دلہن کو اپنے شوہر کے اس عجیب رویہ سے الجھن ہو رہی تھی۔ اپنی سہیلیوں سے (جن میں سے کچھ دو دو بچوں کی مائیں تھیں)، پہلی رات کے متعلق اس نے جو کچھ سُن رکھا تھا، وہ جیسے اس کی گرفت میں آ کر دور چلا جاتا تھا۔ اپنے شوہر کی خوبصورتی، اس کی قابلیت اور فرض شناسی کی اس نے بہت تعریفیں سُن رکھی تھیں۔ یونیورسٹی میں وہ پروفیسر تھا اور ڈیڈی نے نہ صرف اس کے ساتھ پروفیسروں بلکہ اس کے شاگردوں تک سے اس کے متعلق ہر طریق سے ہر طرح کی معلومات حاصل کی تھیں اور پوری طرح مطمئن ہو کر ہی انھوں نے یہ رشتہ منظور کیا تھا۔ اس کا ہونے والا منگیتر سنکی ہے یا اس کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے؟ یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا تھا۔ اپنے شوہر کی اس بے رخی کے متعلق سوچتی اور اپنے مستقبل کے قدرے مبالغہ آمیز اندیشوں میں گرفتار دلہن کبھی کبھی اپنے شوہر پر نظر ڈال لیتی اور چپ چاپ اس کے ساتھ ٹہلے جاتی ــ چاندنی کی طرف اس کا ذرا بھی دھیان نہ تھا۔

اور کیشی کا دماغ ایک دلدل بنا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی سوچ نہ پا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کیے، بائیں ہاتھ کی کلائی کو دائیں ہاتھ سے باندھے۔ کندھے ذرا جھکائے، وہ چپ چاپ ٹہلے جا رہا تھا۔ جب وہ دوسری بار گیٹ تک پہنچے تو اچانک کیشی نے کہا۔

"آؤ ذرا باہر چلیں"

"رات کافی ہو گئی ہے!" دلہن نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

کیشی کو اچانک اپنے ایک دوست کی بات یاد آ گئی۔ جس نے کبھی اپنے نئے عشق کا قصہ سُناتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ پانی کی ٹنکی سے گرانڈ ٹرنگ روڈ کے پھاٹک تک سڑک اتنی سنسان، سایہ دار اور پراسرار لگتی ہے۔ کہ محبت کرنے والوں کے لئے اس سے بہتر کوئی سڑک نہیں۔ اور وہ بولا......

"بس ذرا پانی کی ٹنکی تک جائیں گے۔"

کیشی بنگلے کا پھاٹک کھول کر باہر نکلا۔ "پانی کی ٹنکی کہاں ہے ؟"

دلہن کو معلوم نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ کیشی اسے وہاں کا مدود اربعہ بتانے لگا کہ کس طرف کون سی عمارت ہے اور کس طرح وہاں پہلے زیادہ تر ریلوے کے انگریز افسران رہتے تھے۔ پھر کیسے آزادی کے بعد وہ لوگ چلے گئے اور وہ بنگلے ہندوستانیوں کے قبضہ میں آگئے۔ آٹا مل کے پاس سے گذرتے ہوئے اُس نے بتایا کہ وہاں کیسے آٹا اور میدہ تیار کیا جاتا ہے، کیسے وہاں مالکوں نے کولڈ اسٹوریج بنا رکھا ہے جہاں وہ لاکھوں من آلو ہر سال اسٹور کر کے بیچتے ہیں۔ پریس کے پاس پہنچکر اس کی کھڑکیوں کے شیشوں میں سے وہ بڑے جوش سے روٹھری مشین کے کام کرنے کا ڈھنگ اُسے سمجھانے لگا ــ کس طرح ایک جانب سے کاغذ لگتا چلا جاتا ہے اور دوسری جانب سے پورا اخبار چھپکر اور مڑ کر نکلتا جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی جانب چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے پھر پانی کی ٹنکی سے گرانڈ ٹرنک روڈ تک کی تنہائی کی یاد آئی اور وہ مڑکر ریلوے پھاٹک کی طرف ہو لیا۔ پھاٹک بند تھا۔ لال بتی دیکھ کر کیشی نے کہا......

"یہ پھاٹک بھی ایک مصیبت ہے۔ چوبیسوں گھڑی ایک نہ ایک گاڑی گزرتی رہتی ہے۔ اتنا بڑا اسٹیشن بن گیا، لیکن اس پھاٹک کی قسمت نہیں جاگی۔ یہاں پُل بنے تو یہ مصیبت دور ہو "

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی، برابر کے راستے سے نکل کر وہ پانی کی ٹنکی تک آگئے۔ دائیں جانب سڑک کھلی اور روشن تھی۔ بائیں جانب تاریک سایہ دار۔ جب کیشی ادھر مڑنے لگا تو ایک بار پھر دلہن نے کہا۔

"چلئے اب گھر چلیں، رات کافی ہو گئی ہے "

لیکن کیشی نے اسے اپنے داہنی بازو میں لے لیا۔

"چلو! کچھ دور تک چلتے ہیں، کیسی چھٹکی ہوئی چاندنی سڑک پر پھیلی ہے "

"اس طرف کیوں نہیں گئے؟ بڑی کھلی سڑک ہے "

"کیوں! ڈر لگتا ہے " اور ذرا ہنستے ہوئے جھک کر اس نے دلہن کی پیشانی چوم لی۔

دلہن تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گئی ــ "کیا کرتے ہو سڑک پر ــ "

کیشی نے ہنس کر پھر اسے اپنے بازو میں لے لیا۔

"کون ہے یہاں اس وقت ؟" ہنس کر اس نے اسے چومنا چاہا، لیکن جب ہی سامنے سے تیز روشنی اس کی آنکھوں میں پڑی اور لمحہ بھر بعد ایک بغیر باڈی کا ٹرک گھڑگھڑاتا ہوا ان کے پاس سے نکل گیا۔ ابھی ان کی آنکھوں کی چکا چوندھ دور بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسرے کی بتی آنکھوں میں کوندی اور پھر تو ایک کے بعد ایک۔ ویسے کتنے ہی ٹرک گزر گئے ــ جانے کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ کیا خوب سنسان اکیلی سڑک ہے کیشی نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کا سارا رومان ہوا ہو گیا۔

"چلئے اب چلیں " دلہن نے جو پہلے سڑک کی بتی دیکھ کر ہی اس کے بازوؤں کے حلقہ سے نکل گئی تھی

تقریباً تیکھے لہجے میں کہا۔

"میں تھک گئی ہوں۔"

"یہ کانپور روڈ ہے دن رات یہاں ٹرک اور موٹریں گھڑگھڑاتی ہیں۔" کیشی نے اسے سمجھایا۔ "چلو.... ایم۔ٹی لائنز کی جانب چلتے ہیں، گرجے تک بالکل سونی سڑک ہے۔"

"واپس چلئے! میں تھک گئی ہوں۔" دلہن ممنائی۔

لیکن اسے پھر بازو میں بھرتا ہوا کیشی ملٹری لائنز کی کھلی سڑک پر بڑھ چلا۔

سڑک کی دونوں جانب بنگلوں پر چاندنی خاموش برس رہی تھی۔ ٹھہری، نتھری جیسے حیران، کھلی سڑک، کناروں پر درختوں کے نیچے اندھیرے اجالے کے جال...... جبھی کہیں سے خوشبو کا ایک تیز جھونکا آیا۔ کیشی کے تصور میں چاندنی ہی کی طرح کھلی مسکرائی رات رانی گھوم گئی جس کی ہر سانس فضا کو معطر بنا رہی تھی۔

—— کیشی نے دلہن کو پھر بازو میں بھر لیا اور سڑک کے کنارے پیڑوں کے سائے میں ہوگیا۔

"کیا بہت تھک گئی ہو۔؟"

دلہن نے جواب نہیں دیا، اپنے جسم کا بوجھ اس نے اپنے شوہر پر ڈال دیا اور پیڑ کے چھدرے سائے میں اسے اپنے سینے سے لگائے —— کیشی نے اسے چوم لیا عین اس وقت پرے، سڑک سے ٹارچ کی روشنی چمکی۔ دونوں الگ ہوگئے۔ کیشی کا رنگ فق ہوگیا اور دل دھڑک اٹھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ ایم۔ٹی لائنز میں بارہ کے بعد گھومنے کی اجازت نہیں۔

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو

جو بھی ہو تم، خدا کی قسم لاجواب ہو

گہری ہری وردیاں پہنے تین چار فوجی کسی نئے فلم کا مقبول عام گانا گاتے چاندنی کے باوجود ٹارچ ان پر پھینکتے ہوئے سڑک سے گزر گئے۔

گانے کی پہلی لائن سنتے ہی کیشی نے چاہا تھا کہ اپنی دلہن کو باہوں میں بھر لے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا گائے ؏ .... چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو

لیکن فوجیوں کی بدتمیزی نے اس کا سارا ولولہ ختم کر دیا۔ اسے ایک دوست کی بات یاد آگئی۔ جو ایم۔ٹی لائنز کے ایک بنگلے میں اپنی بہن کے ساتھ کھانے پر آیا تھا۔ باتیں کرتے کرتے بارہ بج گئے تھے۔ جب ساڑھے بارہ کے لگ بھگ رکشہ نہ ملنے سے وہ پیدل آ رہے تھے تو سپاہیوں نے ٹوکا اور دوست کو واپس بنگلہ پر پہونچکر ثابت کرنا پڑا کہ وہ اپنی بہن ہی کے ساتھ وہاں کھانے پر آیا تھا...... اس سے پہلے کہ دلہن گھر چلنے کی التجا کرتی، کیشی واپس لوٹا۔ جب فوجی نے گانا گاتے گاتے ٹارچ کی روشنی اس کی دلہن پر ڈالی تھی تو مارے غصے کے کیشی کا جی چاہا تھا کہ اس کا کالر پکڑ کر دو تھپڑ جما دے۔ لیکن اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ یونیورسٹی کا پروفیسر اپنی دلہن کے ساتھ آدھی رات کو اس سنسان مقام

پر کیوں گھوم رہا ہے ؟ تو وہ کیا جواب دیتا . . اور اس کا سارا غصہ اپنی شان پر، پلنگ پر اور اپنی ذہنی کمزوریوں پر امنڈ پڑا ۔

وہ تیز تیز چلتا واپس آیا ۔ دلہن ذرا اس سے پیچھے گھسٹتی چلی آئی ۔ بنگلے میں پہنچ کر اچانک کیشی کی چال دھیمی ہو گئی، لیکن دلہن نہیں رکی، تنکی ہوئی وہ بڑھی چلی گئی اور جا کر پلنگ میں دھنس گئی ۔ کیشی جب کمرے میں داخل ہوا تو وہ ٹانگیں نیچی کئے چت لیٹی تھی ۔ ساڑھی کا پلو ایک جانب لٹکا تھا، بلاوز کے کھلے گلے سے اس کا گورا سینہ شیشے کی طرح جھلک رہا تھا ۔ کیشی کا جی چاہا وہ گھٹنوں کے بل نیچے فرش پر بیٹھ جائے اور اپنا سر اس کی گود میں رکھ دے ۔ لیکن اپنی بیوی پر سے پھسلتی اس کی نظر غیر شعوری طور پر اپنی ماں کی اس تصویر پر چلی گئی اور وہ تذبذب کے عالم میں کمرے کے درمیان کھڑا رہا ۔ دلہن چپ چاپ چھت کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں ۔ کیشی کی نظریں اچانک بیچ کے دروازے پر گئیں اور اس نے کہا ۔

" یہ کمرہ تو باہر سے بند تھا نا ؟ "

" جی ! دلہن نے اسی طرح چھت پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا ۔

کیشی نے کمرے کے دو چکر لگائے ۔

" اس کی چابی کہاں ہے ؟ "

" انٹی کے پاس ہوگی . سب سامان انہی نے رکھوایا تھا "

کیشی باہر نکل کر کاریج کے دوسرے کونے تک گیا ۔ ماں کے کمرے کی بتی بجھ چکی تھی ۔ تھکی ہوئی عورتیں سو گئی تھیں .... اس کے دل میں آیا ماں کو جگائے ۔ لیکن خالہ جاگ گئی اور اس نے مذاق کر دیا تو .... وہ واپس پھرا ۔ کمرہ میں آ کر کچھ لمحہ گھومتا رہا ۔ اس کی نگاہ دلہن پر گئی ـــ وہ اسی طرح چت لیٹی چھت کو تکے جا رہی تھی ۔ اچانک بڑھ کر اس نے بیچ کے کمرہ کا دروازہ پیچھے کی طرف دھکیلا ۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور نیچے کی چٹخنی لگی تھی ۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر صرف اوپر کی چٹخنی لگی ہوگی تو اوپر کا شیشہ توڑ کر کھول لے گا ۔ لیکن ماں ہمیشہ کواڑوں کی نچلی چٹخنیاں لگاتی تھی ۔

پیچھے ہٹ کر اس نے دروازہ پر ایک نظر ڈالی ـــ دونوں کواڑوں میں تین تین شیشے لگے تھے اور پھر لکڑی کا پلہ تھا ۔ اگر وہ تیسرا شیشہ توڑ دے تو ہاتھ ڈالنے پر نچلی چٹخنی کھل سکتی ہے ۔ اور اس کے جی میں آیا کہ زور کا ایک مکا مار کر شیشے کو چکنا چور کر دے لیکن تھکی ماندی ماں کے جاگ پڑنے کا خیال اس کے جوش پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا بن گیا دونوں مٹھیاں کمر کے پیچھے باندھے وہ کمرہ میں گھومنے لگا ۔ دو ۔ تین چکر لگا کر وہ پھر دروازے کے سامنے اکھڑا ہوا ۔ جبھی اسکی نظریں دروازہ کے نچلے حصے پر پڑیں ۔ دائیں کواڑ کا کونا چوٹ کھایا ہوا تھا ۔ نزدیک جا کر اس نے دیکھا روزن میں ایک ہلکی سی لکیر صاف دکھائی دے رہی تھی ۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا ۔ پیٹھ اس نے پلنگ کی پٹی سے لگائی اور ایڑی کا نچلا حصہ کواڑ کے اس چوٹ کھائے حصے پر اڑا کر پورا زور لگایا ۔ دروازہ تو نہیں ہلا لیکن پلنگ پیچھے کو کھسک گیا ۔

چھت کی طرف تکتی ہوئی دلہن اسی طرح لیٹی رہی۔ پلنگ کے ہلنے کا جیسے اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اچانک کیشی نے اس پر ایک چور نگاہ ڈالی۔ اس وقت دلہن نے اس کی جانب دیکھا ــــ نہ جانے ان نگاہوں میں کیا تھا؟ طنز کی ایک خفیف سی جھلک ... جو کسی خبطی کے کرتب دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ کیشی کے سر پر جنون سوار ہوگیا۔ اس کی سوجھ سمجھ کی ساری قوتیں سلب ہوگئیں۔ اچھل کر وہ اٹھا اور بڑھ کر اس نے زور کا مکّا نچلے شیشہ پر دے مارا۔ شیشہ جھنجھنا کر ٹوٹ گیا۔...

دلہن لیٹی نہ رہ سکی۔ قدرے گھبرا کر وہ اُٹھی اور اپنے شوہر کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس نے چڑ کر کہا۔

کیشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی جانب دیکھا تک نہیں۔ ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ ڈال کر اس نے چٹخنی کھولی۔ اس کے جسم کے بوجھ سے اچانک دروازہ پیچھے کو ہٹ گیا۔

بائیں ہاتھ سے کواڑ تھام کر کیشی نے نہایت آہستگی سے ہاتھ باہر نکالا تھا تو بھی کہنی کے اوپر خراش آگئی تھی۔

"ہائے آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس کی پھٹی قمیص سے خون رستے دیکھ کر دلہن نے گھبرائے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا اور اس کی خوف زدہ نگاہیں سارے کمرے میں گھوم گئیں کہ کہیں کپڑے، جس سے وہ زخم پر پٹی باندھ دے۔

کیشی نے ادھر دھیان نہیں دیا۔ دونوں ہاتھوں سے کواڑ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ مشتاق انگلیوں سے اس نے بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرہ میں جہیز کا سارا سامان گڈمڈ پڑا تھا۔ فرنیچر، ڈریسنگ ٹیبل، الماری، کپڑوں کی گٹھریاں، میوے مٹھائیوں کے تھال۔ ایک جانب وہ پلنگ بھی پڑا تھا جو جہیز میں آیا تھا۔ اور اس پر بے شمار کپڑے لدے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں بھر بھر کر اس نے کپڑے صوفے پر پٹکے۔ دلہن اس کے پیچھے پیچھے اندر آگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں طنز کی جگہ پھر خوف نے لے لی تھی اچانک پلٹ کر کیشی نے اسے دونوں کاندھوں سے تھام لیا۔ پل بھر وہ اُن ڈری، سہمی آنکھوں میں جھانکتا رہا، پھر یکایک اس نے اسے دونوں باہوں میں بھر کر چوم لیا۔

دلہن اور بھی سہم گئی۔ لیکن اپنے شوہر کی آنکھوں میں اس نے کرختگی کی جگہ بے پناہ محبت رقصاں دیکھی اور اس کے گرم ہونٹوں کا لمس اپنے کانوں کی لوؤں کے نیچے گردن پر محسوس کیا تو اس کے سہمے ڈرے اعضا ڈھیلے پڑ گئے اور وہ اس کے بال سہلانے لگی۔

علی الصباح ماں باہر آئی تو حجلۂ عروسی کا دروازہ چوپٹ کھلا دیکھ کر چونکی! ــــ دبے پاؤں بڑھ کر اس نے پردہ ذرا ہٹایا تو دن دھک سے رہ گیا..... سجا سجایا کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہیں بیچ کے کھلے دروازے کے نزدیک فرش پر بکھرے شیشے کے ٹکڑوں پر گئیں۔ چوری کے خوف سے گھبرا کر وہ اُدھر بڑھی..... چوکھٹ ہی میں سن کھڑی رہ گئی... کوچ کی گدیاں سر کے نیچے رکھے، جہیز کے کھرّے پلنگ پر دولہا، دلہن بے سدھ پڑے سو رہے تھے!!

کرائم اسٹوری!

انور
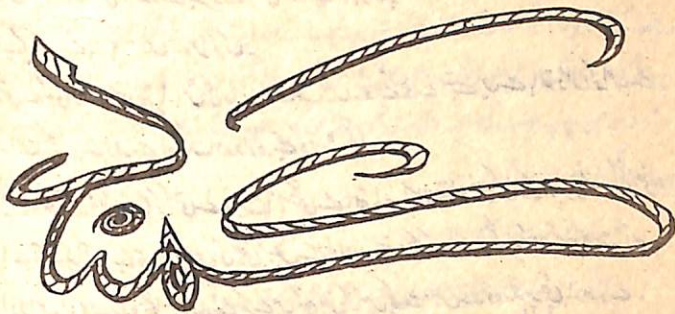
وہ سنسنی خیز خبر، جو چھ ماہ ہوئے، اخباروں میں شائع ہوئی تھی اور جس میں بیان کیا گیا تھا کہ ایک شادی شدہ جوڑا اپنی نئی کار میں کلفٹن کے ساحل پر اصلی تفریح گاہ سے دور، غروب آفتاب کا لطف اٹھا رہا تھا کہ اچانک خانقاہ کی جانب سے ایک جیپ آئی اور اس میں بیٹھے ہوئے تین مسلح بدمعاشوں نے اس معصوم نوجوان جوڑے پر ریوالور سے پانچ فائر کئے، عورت تو وہیں ہلاک ہوگئی اس کا شوہر بری طرح زخمی ہوا۔ بدمعاش زیورات اور نقدی لے کر جیپ میں فرار ہو گئے۔ یہ دل ہلا دینے والی سنسنی خیز خبر غلط ہے۔ وہ عورت جو بدمعاشوں کے ریوالور سے وہیں ہلاک ہو گئی تھی، شادی شدہ نہیں تھی اور وہ شخص جو ریوالور کے فائروں سے بری طرح زخمی ہو گیا تھا، میں تھا۔

میں آج ہی ہسپتال سے باہر آیا ہوں، اور اس وقت اصغری بیگم کی قبر پر کھڑا ہوں، اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور میرے دل میں غم کا طوفان بپا ہے۔

دراصل اس خبر کا سنسنی خیز حصہ درست ہے۔ لیکن اس کا دل ہلا دینے والا حصہ کسی کو معلوم نہیں۔ صرف مجھے معلوم ہے اور آج صبح میں جب ہسپتال سے باہر آرہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں موت کے منہ سے نکل کر دنیا کو زندگی کا کوئی پوشیدہ راز بتانے جا رہا ہوں۔ اور اب اصغری بیگم کی قبر پر کھڑے ہو کر

میں محسوس کر رہا ہوں جیسے قدرت نے مجھے اس حادثے کے پیچھے چھپی ہوئی دل ہلا دینے والی کہانی سنانے کے لئے ہی زندہ رکھا ہے۔

اس دن میں بہت خوش تھا۔ پہلی ریس کو چھوڑ کر باقی سب ریسوں میں میرے گھوڑے جیت گئے تھے پہلی ریس میں مجھے کوئی ایک ہزار روپے کا نقصان ہوا تھا۔ لیکن باقی جیتی ہوئی ریسوں میں تین فلوک تھے اور چار فیورٹ۔ اس طرح میں سیزن کا نقصان پورا کر کے اب کوئی اٹھائیس ہزار روپے اَپ تھا۔

چھٹی ریس میں جب سبز پری اوّل آئی تو ریس کورس پر سناٹا چھا گیا۔ سبز پری پر لگانے والے میرے علاوہ صرف تین اور تھے جن کو میں نے ٹپ دیئے تھے۔ سبز پری عجیب وغریب گھوڑی ثابت ہوئی اور بہت زرخیز فلوک۔ اس نے پانچ روپے کے ٹکٹ پر پانچسو چالیس روپے ادا کئے۔ جب اختتام سے ایک فرلانگ پہلے سبز پری نے دوسرے گھوڑوں کو کاٹنا شروع کیا ہے تو ریس کورس میں صرف چار آوازیں گونج رہی تھیں۔ سبز پری سبز پری، سبز پری، سبز پری۔ جب سبز پری ایک پوری لنگتھ سے ریس جیت گئی تو میری دوربین دھب سے میرے سینے پر آ کر گری اور میں اپنی فائل اور اپنی تھرموس بوتل بنچ پر چھوڑ کر بے تحاشا ریلنگ کے بائیں کنارے کی طرف بھاگا، اور جب بورڈ جیتنے والے گھوڑوں کے نمبروں کے اوپر سبز پری کا نمبر نمودار ہوا اور جب سبز پری اپنے سبزی مائل سیاہ سینے کو تانے ہوئے ریلنگ کے پاس سے گزری تو میں پاگلوں کی طرح چلا اٹھا۔ "سبز پری زندہ باد۔ سبز پری زندہ باد!!"

اور جب میں واپس اپنی سیٹ پر آیا تو میں نے دیکھا کہ میری تھرموس بوتل کے پاس سبز پری بیٹھی ہے۔ اس کا سنگ مرمر کا بنا ہوا چہرہ نائلون کی ساڑھی کے کناروں کے درمیان سرچ لائٹ کی طرح دمک رہا تھا۔ اور اس میں ایک اور غیر معمولی بات تھی، کوئی ایسی غیر معمولی بات جو مجھے نہایت غیر مہذب انداز میں اس کو دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ غیر معمولی بات کیا تھی! وہ غیر معمولی بات کیا تھی!!

لیکن میں تو اس لمحے دنیا کا مشغول ترین انسان تھا۔ میرے پاس عورتوں کی دلکشیوں پر ضائع کرنے کے لئے وقت کہاں تھا۔ میں نے اپنی تھرموس بوتل اُٹھائی اور کیش کاونٹر کی طرف چل پڑا۔

لیکن طاؤس کے تاروں میں ایک نہایت حسین نغمہ جھنجنا اٹھا۔

"معاف کیجئے زحمت ہوگی ان دو ٹکٹوں پر میرا کیش لے آیئے۔"

اُف ترنم! اُف موسیقی اور اس کو ایک دفعہ پھر دیکھنے کا موقعہ! میں ایک لمحے کے لئے اس کی غیر معمولی پنہاں جاذبیت میں گم ہو گیا اور پھر جیسے نیند سے بیدار ہو کر بولا۔

"کون سا گھوڑا؟"

"نمبر ۵"

"سبز پری"

"سنر پری!"

"او — کس نے بتایا آپ کو؟"

"پھر بتاؤں گی، کیش لے آئیے۔ تھرموس اور فائل یہیں رکھ دیجیئے۔ میں ان کی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

"اور آپ کے..... ؟"

"میرے شوہر! وہ دفتر میں ہوں گے۔ مجھے ٹیلی فون کیا تھا کہ سیدھی ریس کورس پہونچ جاؤں۔ ابھی تک نہیں آئے شاید کوئی ضروری کام آپڑا ہو گا۔"

"لیکن آج اتوار ہے۔"

"جی نہیں آپ بھولتے ہیں آج سیٹرڈے ہے اور سیزن کا آخری دن۔ کل اتوار سے رمضان شروع ہو رہا ہے اور رمضان کے احترام میں ریس کورس بند کیا جا رہا ہے۔"

"ارے ہاں میں بھول رہا تھا۔ آپ نے اس یاد سے میری خوشی میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں پورے سیزن میں بُری طرح ہارتا رہا ہوں آج میں نے اپنا سارا خسارہ پورا کر لیا ہے اور کافی اَپ چلا گیا ہوں۔ آج سیزن بند ہو جائے گا اور مجھے اگلے اتوار ہارنے کے لئے یہاں نہیں آنا پڑے گا۔"

وہ ہنس پڑی اور فضا میں موتی بکھر گئے

میں نے تھرموس بوتل اور فائل وہیں رکھ دیئے اور کیش لینے چلا گیا۔

کاؤنٹر پر جا کر میں نے اس خاتون کے ایک ہزار اٹھائی روپے لئے اور ان کو اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا اور جیب میں اپنا کیش گن رہا تھا تو ایک حقیقت بجلی کی طرح میرے ذہن پر کوندی اور وہ غیر معمولی جاذبیت جو میں اس خاتون میں محسوس کر رہا تھا لیکن سمجھ نہیں سکا تھا، اچانک میرے سامنے آگئی اور وہ غیر معمولی بات ثابت ہوئی کہ میں بے حد مایوس ہوا۔ وہ غیر معمولی جاذبیت اس خاتون کے ہونٹوں کی لپ اسٹک تھی۔

لپ اسٹک سے مجھے بڑی نفرت ہے۔ لپ اسٹک کے ساتھ موڈرن عورت بڑی خونخوار نظر آتی ہے موڈرن عورت کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی بڑے اہتمام سے بنی ہوئی لکیریں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مردوں کا خون بڑے آرٹسٹک طریقے سے چوستی ہے۔ بدصورت عورت بغیر کسی لپ اسٹک کے بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ مجھے سانولی عورت کے اُودے اُودے ہونٹ سفید عورت کے گلابی گلابی ہونٹ اور زرد عورت کے سفید سفید ہونٹ بڑے اچھے لگتے ہیں۔ وہ آپ کو فریب میں مبتلا نہیں کرتے۔ وہ سچ بولتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، دیکھو ہم بدصورت ہیں ہم پر اپنا وقت ضائع مت کرو۔ جاؤ اپنے اپنے گھروں کو۔ اور دوسری طرف کسی ایمائی ماری ہوئی عورت کے لپ اسٹک سے لپے ہوئے، جھوٹے دغاباز اور مکّار ہونٹ کہتے ہیں، ہمیں دیکھو ہم کتنے حسین ہیں! کتنے صحت مند! کتنے تندرست! ہماری طرف دیکھو! ہمارے پاس آؤ! آؤ! آؤ!!

پھر اس خاتون کے لپ اسٹک میں چھپے ہوئے ہونٹوں میں مجھے غیر معمولی جاذبیت کیوں نظر آتی ہے۔

یہ کیا الجھن ہے! یہ کیا راز ہے۔

جب میں گیلری واپس آیا تو وہ خاتون میری ریسوں کی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی اور اس کے پاس چائے کی ٹرے پڑی تھی میں نے اس کو ایک ہزار اٹھاسی روپئے کے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"چائے کی ٹرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر آ گئے ہیں"، اس نے تھینک یو کہہ کر نوٹ لئے۔ گنے اور اپنے پرس میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جی نہیں میرے شوہر نہیں آئے۔ لیکن چائے کا ٹائم آگیا ہے۔"

میں نے مشورہ دیا: "بہتر ہوتا اگر چائے کے لئے ان کا انتظار کیا جاتا۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "گھبرائیے نہیں، آپ کو میرے ساتھ چائے پیتے دیکھ کر وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ میرے شوہر بڑے ایڈوانسڈ ہیں آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ خصوصاً جب انھیں معلوم ہوگا کہ سبز پری کا ٹپ مجھے آپ سے ملا تھا۔"

"مجھ سے"

"جی ہاں۔ اگر آج میرے شوہر یہاں ہوتے تو سبز پری ان کو بھی مالا مال کر دیتی۔ میرے شوہر ریس کے بہت رسیا ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ افسر ہیں اور اپنی تنخواہ ریسوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر ملک میں رشوت کی رسم نہ ہوتی تو ان کی فیملی بھوکی مر جاتی۔ ان کو ریس سے منع کرنا ایسا ہے جیسا کسی پیاسے کو پانی سے منع کرنا۔ ان کی پہلی بیوی بڑی بیوقوف تھی۔ ان کو ریس کورس سے باز رکھنے کے سلسلے میں ان سے ہمیشہ فساد رکھتی تھی آخر وہ طلاق دینے پر مجبور ہو گئے اور اب وہ اپنے چھ بچوں کے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ میں ان کو ریس کورس سے منع نہیں کرتی۔ ہر ریس میں ان کے ساتھ آتی ہوں تاکہ اگر میں ان کو ریس سے باز نہیں رکھ سکتی تو کم از کم ریس میں زیادہ روپیہ لگانے سے منع کروں۔ آج وہ نہیں آئے اور میں کاونٹر کے پاس سے گزر رہی تھی۔ آپ کو سبز پری پر پانچسو روپیہ لگاتے دیکھا۔ جی چاہا کہ آپ کو اتنا روپیہ لگانے سے منع کروں۔ لیکن معلوم نہیں مجھے کیا ہوا۔ آپ کو منع کرنے کے بجائے میں نے بھی سبز پری پر دس روپئے لگا دیئے۔ کتنے چمچے چینی۔؟"

میں نے جلدی سے کہا "معاف کیجئے میں چائے نہیں پیتا کوفی پیتا ہوں۔ میری تھرموس میں بہت کوفی ہے۔" وہ بھی جلدی سے بولی۔

"معاف کیجئے، میں کوفی نہیں پیتی، چائے پیتی ہوں۔ اس لئے آپ چائے پئیں گے اور میں کوفی۔"

ساتویں ریس کے گھوڑے پیڈاک میں آ گئے تھے۔ خاتون میری دوربین لے کر گھومتے ہوئے گھوڑوں کو دیکھنے لگی اور دیکھتے دیکھتے بولی۔

"اس ریس کے لئے آپ کو کون سا گھوڑا پسند ہے۔"

میں نے کہا۔ "آج رات میں نے خواب میں ایک ایسا گھوڑا دیکھا ہے جس کی دم کٹی ہوئی تھی۔ ذرا غور سے دیکھئے ان گھوڑوں میں کوئی ایسا گھوڑا تو نہیں جس کی دم کٹی ہوئی ہو۔"

وہ دوربین سے سب گھوڑوں کو دیکھنے کے بعد بولی ۔ "جی نہیں کوئی نہیں "

میں نے مشورہ دیا " اچھا کتاب سے سب گھوڑوں کے نام پڑھیے "۔

وہ پڑھنے لگی " مائی داس ، سپوٹنک ، گولڈ ڈسٹ ، لنڈی کوتل "

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ۔ " ٹھہریے ، لنڈی کوتل جیتے گا ۔ لنڈی کا اشارہ کٹی ہوئی دم کی طرف ہے اور کوتل گھوڑے کو بولتے ہیں "

چنانچہ لنڈی کوتل جیتا ۔ لیکن اس ریس میں میں زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکا ۔ کیونکہ اس خاتون نے مجھے زیادہ روپیہ لگانے سے منع کر دیا تھا ۔

شام ہو گئی ریسنگ سیزن ختم ہو گیا ۔ خاتون کا خاوند نہ آیا ۔ میں نے کہا ۔ " اگر کہیں تو میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ آؤں میرے پاس کار ہے "۔

وہ بولی نوازش ہو گی " میں نے آج آپ کو بہت زحمت دی "

" جی بالکل نہیں ۔ آئیے "

میں نے اس کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا ۔ لیکن وہ بولی ۔ " اگر آپ کار خود ڈرائیو کر رہے ہیں تو میں آپ کے پاس آگے بیٹھوں گی ۔ تاکہ آپ کو اپنے بنگلے کا راستہ بتانے میں آسانی ہو "

" جی بہتر ۔ کدھر چلیے گا ۔ "

" کلفٹن ۔ وہ کلفٹن بینڈ اسٹینڈ کے پاس نئے بنگلے بنے ہیں ان میں ایک "

کار چل پڑی ، باتھ آئی لینڈ کے پاس جا کر اس نے خاموشی کا طلسم توڑا " وہ سامنے نیلا بنگلہ ۔ بینڈ اسٹینڈ کی طرف سے چوتھا "

تھوڑی دور جا کر وہ پھر بولی ۔ " آپ اتنا تیز کیوں جا رہے ہیں ؟ کیا آپ کو بہت جلدی ہے ؟

میں نے کہا " جی نہیں ۔ میرا خیال ہے آپ کا انتظار ہو رہا ہو گا "

اس بنگلے کے ماحول میں کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا ۔ برج شروع ہو گئی ہو گی ۔ کوئی نئی پارٹنر آ گئی ہو گی شراب کی بوتلیں کھل گئی ہوں گی ، میرے بنگلے کا ماحول زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے "۔

" کہیں تو کار آہستہ کر دوں ؟ "

" جی نہیں ۔ آپ کی وائف انتظار کر رہی ہوں گی "

" جی نہیں ۔ میں نے ابھی شادی نہیں کی ۔ میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں "

" تو پھر میں آپ کو تھوڑی سی اور زحمت دوں گی ۔ مجھے کلفٹن کے ساحل پر چھوڑ آئیے ۔ میں اس وقت سیر کرنے کی عادی ہوں "

"لیکن کیا اس وقت کلفٹن کے ساحل پر ایک لیڈی کا اکیلے سیر کرنا محفوظ ہوگا ؟"

"بالکل محفوظ - میں پچھلے دو سال سے اس وقت وہاں روزانہ پیدل سیر کرنے جاتی ہوں اور آج اگر آپ کو میرا فکر کھائے جا رہا ہے - تو آپ میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہیں ؟"

میں لاجواب ہوگیا -

ہم نیلے بنگلے کے پاس سے گزر گئے - کلفٹن کا ساحل آگیا - اس کی خواہش پر ہجوم سے پرے غیر آباد ساحل پر لے گیا - ہم کار سے نیچے اترے - سمندر کی لہریں فضا میں موسیقی بکھیر رہی تھیں - دھیمی مرطوب ہوا چل رہی تھی - شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے - سورج غروب ہو رہا تھا -

یکایک لپ اسٹک کی غیر معمولی جاذبیت کا راز کھل گیا - وہ لپ اسٹک کی سرخی کہاں تھی - وہ مصور کے موقلم کا اعجاز تھا وہ تو سنگ مرمر کے چہرے کا ایک مرکزی مقام تھا - وہ تو آرٹ کی تکمیل کی طرف ایک اہم قدم تھا - اس نے مجھے چونکا دیا -

"آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں ؟"

"او - معاف کیجیئے -"

"میرے پاس وقت بہت کم ہے - میں آپ سے ایک بہت اہم بات کرنا چاہتی ہوں - اگر آپ کو میرا چہرہ دیکھنے سے فرصت ہوگئی ہو تو عرض کروں -"

"فرمائیے میں شرمندہ ہوں"

"میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کے سامنے کسی بلڈنگ میں آگ لگی ہو اور دھویں اور شعلوں میں الجھی ہوئی انسانی آوازیں پکار رہی ہوں مجھے بچاؤ ! تو آپ کیا کریں گے ؟"

اس کے الفاظ نے میرے ذہن کے پردوں پر میری زندگی کا ایک نہایت مکروہ واقعہ اجاگر کر دیا - میری زندگی کا یہ مکروہ واقعہ مجھے جب بھی یاد آتا ہے میری نظریں ندامت سے جھک جاتی ہیں - میری نظریں خاتون کے حسین چہرے سے جھک کر اس کے پاؤں کے پاس آگئیں اور میں بت کی طرح سکتے کے عالم میں کھڑا رہا -

وہ پھر بولی "میں پوچھ رہی ہوں کہ اگر سیڑھیوں پر کسی کا پاؤں پھسل جائے اور وہ سمندر میں گر جائے اور اپنی جان بچانے کے لیئے چیخنے لگے - مجھے بچاؤ !! مجھے بچاؤ !! تو آپ کیا کریں گے ؟"

میں اسی طرح خاموش، اس کے پاؤں کے پاس اپنی نظریں گاڑے کھڑا رہا -

اب کے وہ جھنجلا کر بولی - "مجھے آپ کی خاموشی نے حیران کر دیا ہے - کیا آپ ایسے سادہ سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتے ؟ کیا آپ دور کھڑے ہو کر کسی کو جلتے ہوئے اور ڈوبتے ہوئے دیکھتے رہیں گے ؟"

کیا آپ کے دل میں اُسے بچانے کی تمنا نہ ہوگی۔؟"
میرے ذہن سے صدمے کا اثر زائل ہو رہا تھا اور اب میں اس کی باتوں کا جواب دینے کے قابل ہوگیا تھا۔ میں نے کہا "ہوگی"
"پھر آپ بولتے کیوں نہیں؟ آپ کی زبان بند کیوں ہوگئی ہے"
"محترم خاتون، میں ایک بزدل انسان ہوں میرا قد چھ فٹ لمبا ہے، میرا سینہ ۴۳ انچ چوڑا ہے۔ میرے بازو لوہے کی طرح سخت ہیں۔ میں تندرست و توانا ہوں اور جب مجھے یاد آتا ہے تو میں پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو جاتا ہوں۔ میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلتا، میری زبان بند ہو جاتی ہے"
"میں نے آپ کو بزدل نہیں کہا"
"تھوڑی دیر ہوئی آپ نے دو ایسے دردناک منظر پیش کئے تھے، جن میں سے مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ الفاظ میرے دماغ پر بھاری بھاری پتھروں کی طرح گرے۔ ان الفاظ نے مجھے میری زندگی کے ایسے شرمناک واقعے کی یاد دلائی جس میں میں پہلی مرتبہ اس حقیقت سے دوچار ہوا کہ میں بزدل ہوں میں چھ فٹ لمبا ہوں۔ ۴۳ انچ چوڑا سینہ رکھتا ہوں۔ لوہے جیسے بازوؤں کا مالک ہوں اور جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک بزدل انسان اگر کسی جلتے ہوئے اور ڈوبتے ہوئے انسان کو بچانا بھی چاہے تو نہیں بچا سکتا"
"کیا یہ واقعہ میں سن سکتی ہوں؟"
"اتوار کا دن تھا۔ ریسنگ سیزن زوروں پر تھا۔ میرا دوست اور میں تباہ کن بیٹنگ موڈ میں تھے۔ وہ جیت رہا تھا، میں ہار رہا تھا۔ وہ ہار رہا تھا، میں جیت رہا تھا۔ آج جیسا دن نہیں تھا۔ لیکن اچھا دن تھا اور شام کو جب ہم پیسیں چائے پینے گئے ہماری جیبیں کافی بھاری تھیں چائے پینے کے بعد میرے دوست نے اپنی بیوی کے لئے چند قیمتی زیورات خریدے اور ہم کار میں بیٹھ کر ڈرگ روڈ اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ میرا دوست ڈرگ اسٹیشن کی نزدیک ایک بنگلے میں رہتا تھا، اور اس دن اس کی بیوی نے مجھے ڈنر کے لئے بلایا تھا۔ میرا دوست جب بھی ریس کورس بس آتا تھا مجھے اس کو چھوڑنے کے لئے ڈرگ روڈ جانا پڑتا تھا وہ ان دنوں کار چلانا سیکھ رہا تھا اور کراچی سے واپس جاتے وقت میری کار وہی چلاتا تھا۔ اس لئے وہ ان سڑکوں سے بچتا تھا۔ جہاں ٹریفک زیادہ ہو اور ہم ریس ختم ہونے کے بعد ڈرگ روڈ اسٹیشن کو واپس جانے کے لئے ہمیشہ اس اکیلی اور سنسان سڑک کو استعمال کرتے تھے۔ جو ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری کے سامنے سے ہو کر آرڈی ننس ڈپو کے پاس سے گزرتی ہوئی ڈرگ روڈ اسٹیشن پر جا پہنچتی تھی رات سخت کالی تھی اندھیرا بہت ڈراونا تھا۔ ہیڈ لائٹوں کی روشنی کار کے گزرنے کے لئے اتھاہ اندھیرے کے سینے میں دھندلا، سفید سوراخ بناتی جارہی تھی یکایک سڑک کے دائیں کنارے سے ایک عورت ہیڈ لائٹوں کی روشنی میں آگئی، بال بکھرے ہوئے۔ کپڑے پھٹے ہوئے اس نے اپنے دونوں بازو بلند کئے اور چلانے لگی۔ مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ میں نے ریوالور نکال

لیا۔ میرے دوست نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ میں چلّایا "عزیز! کار کو اسٹاپ کرو۔ بریک لگاؤ! روکو! عزیز نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "DON'T BE SILLY" کار کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ عورت کی دردناک پکار سنائی دے رہی تھی مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! مجھے بچاؤ!!! میں نے کہا عزیز روکو کار کو۔ وہ سڑک کے درمیان سے کچلی جائے گی۔ عزیز نے کہا۔ "بیوقوف ہم سخت خطرے میں ہیں۔" وہ مایوس ہو کر سڑک کے دائیں کنارے پر ہو گئی، کار اس کے پاس سے گزر گئی۔ میں عزیز کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ اُس نے کہا۔ "ابے گدھے کے سینگ! تو نے کبھی اخباروں میں جرائم کا کالم پڑھا ہے؟ اگر ہم یہاں ٹھہر جاتے تو ہماری ہڈیوں اور بوٹیوں سے چیلوں اور کوؤں کی ڈنر پارٹی ہوتی۔ اس عورت کیساتھ پورا ایک گینگ تھا ڈرگ روڈ اسٹیشن آگیا۔ میں نے زبردستی کار رکوائی اور عزیز سے کہا۔ "بچو! تو اب یہاں اپنے گھر تک پیدل مارچ کر۔ ڈنر میں شامل نہ ہو سکنے پر بھابی سے معذرت۔ میں اس عورت کی مدد کرنے کے لئے جا رہا ہوں اور میں طوفانی رفتار سے واپس چل پڑا۔ اس مقام پر پہنچ کر میں کار سے اترا، اور سڑک کے نزدیک ایک پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اپنی ریوالور کو ہوا میں ہلاتے ہوئے میں زور زور سے چلانے لگا۔ "کون مجھے مدد کے لئے پکار رہا تھا؟ کون تھا جس نے مجھے مدد کے لئے پکارا تھا؟" میری آواز اردگرد کی پہاڑیوں میں گونجی اور گم ہو گئی۔ میں ایک دوسری پہاڑی پر چڑھ گیا اور پھر چیخنے لگا۔ "محترمہ! میں آپ کی مدد کے لئے آگیا ہوں۔ محترمہ! آپ کہاں ہیں؟" کوئی جواب نہیں۔ میں ایک اور پہاڑی پر چڑھ کر چلانے لگا۔ "بہن آؤ! مجھے بتاؤ تمہیں کیا تکلیف تھی! بہن مجھے بتاؤ، تمہیں کس نے تکلیف پہنچائی تھی؟" وہی خاموشی، وہی سناٹا، وہی اندھیرا۔ میں مایوس ہو کر اپنی کار کی طرف چل پڑا اور کار کے دروازے پر کھڑے ہو کر رقت آمیز لہجے میں بولنے لگا۔ "بہن مجھے معاف کر دو۔ میں ایک بزدل انسان ہوں میری آنکھوں کے سامنے تمہاری حرمت لُٹ گئی اور میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکا۔" میں چپ ہو گیا اور خاموشی تکلیف دہ ہو گئی۔

وہ دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی "آپ بزدل نہیں ہیں، جذباتی ہیں اور جذبات میں بہہ کر حالات کی نزاکت کو محسوس نہیں کرتے۔ میں آپ کے دوست کی عقلمندی کی داد دیتی ہوں۔ اگر وہ آپ کے کہنے پر اس خطرناک علاقے میں کار کو روک دیتے تو ممکن ہے آپ دونوں کی لاشیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس سنسان پہاڑیوں میں بکھیر دیا جاتا۔ اس واقعہ سے آپ کے دوست کی معاملہ فہمی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے آپ کی ـــــ بزدلی ثابت نہیں ہوئی۔ اس واقعہ نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ اگر کوئی بےبس عورت آگ میں جل رہی ہو یا پانی میں ڈوب رہی ہو، تو آپ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھی اس کی مدد کو پہنچیں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ میں کسی آگ میں جلتی ہوئی یا پانی میں ڈوبتی ہوئی مظلوم عورت کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دوں، لیکن مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

اس کا سانس رک گیا اور وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ "میں نے آپ سے کون سی مدد مانگی ہے۔"

"محترمہ! اِدھر اُدھر کی فضول باتیں کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ آپ اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتیں، آپ کی اور آپ کے شوہر کی عمروں میں فرق ہے آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو آپ کے شوہر کے پنجے سے چھڑاؤں۔ معاف کیجیئے۔ میں شادی شدہ عورتوں اور ان کے شوہروں کے درمیان آنا پسند نہیں کرتا۔"

اس کے جواب نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ "کون شادی شدہ عورت؟ کس کا شوہر؟"

اس ظاہر و باطن سوال کا جواب کیا تھا؟ میں نے کہا "آپ اور آپ کا شوہر!"
میرا کوئی شوہر نہیں، میری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، میں ابھی کنواری ہوں۔"

یکایک ڈرامے کا سین بدل گیا۔ ایک نیا کردار میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور میری دلچسپی کا پیمانہ کناروں تک اچھل پڑا۔ میں دیر تک چپ چاپ مبہوت اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر حیرت سے الجھے الفاظ میں بولا۔ "خاتون آپ کون ہیں؟"

"میرا نام اصغری بیگم ہے میں ایسے ماحول میں پیدا ہوئی تھی جہاں شادیوں کے سوال پیدا نہیں ہوتے اور جہاں ہر لمحے شادیاں ہوتی ہیں۔ میری ماں کی چھ لڑکیاں تھیں جن میں سے پانچ پانچ روپے میں پانچ کو خریدا تھا۔ میں چھٹی تھی اور صرف میں اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ میرے باپ بننے کے دعویداروں میں بڑی بڑی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ سب سے پہلے ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد گوہر خاں کو میرا باپ تسلیم کیا گیا۔ گوہر خاں نے بڑا اقتدار حاصل کیا اور اپنے مکّوں اور مونچھوں کے زور پر سارے بازار کا چودھری مقرر ہوا۔

ایک دن اس نے میری ماں کو بُری طرح مارا اور میری ماں نے دوسرے دن موقعہ پا کر اُس کو پارا کھلا دیا۔ جب پارا اس کے گھٹنوں میں اتر گیا تو فوراً امان اللہ نے میرا باپ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ گوہر خاں کی پارٹی نے بُری طرح شکست کھائی اور امان اللہ کو میرا باپ تسلیم کر لیا گیا۔ دراصل میرا باپ ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میری ماں اپنے وقت کی بہت بڑی ناچنے اور گانے والی تھی۔ اور جب اس نے فلموں میں ناچنا گانا شروع کر دیا تھا تو اس کی آمدنی کسی وزیر باتدبیر کے برابر ہو گئی تھی اور ہمارے ان وزیر نے میری ماں کو اپنے سوشل فنکشنوں میں مدعو کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے امان اللہ کے اقتدار سے بہت جلد لوگ جلنے لگ گئے اور اس کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہو گئیں آخر ایک سازش میں اس کے بھتیجے حامد حسین نے امان اللہ کو چاقو سے ہلاک کر دیا۔ اور میرا باپ بن بیٹھا۔ میرے نئے باپ نے میری تعلیم، میرے ناچ اور گانے کی طرف خاص توجہ دینی شروع کر دی۔ میرا نیا باپ مجھے اپنی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے کے لئے اور فلم کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اور اس کی خواہش تھی کہ وہ دنیا میں اسی طرح نام پیدا کرے جس طرح بعض ایکٹرسوں کے "باپوں" نے پیدا کیا ہے۔ میرا تیسرا باپ بڑا طاقتور ثابت ہوا۔ اس نے اپنے تمام دشمنوں کو اپنے

راستے سے ہٹا دیا۔ سوائے ایک دشمن کے۔"

میں اصغری بیگم کی گفتگو کے انداز سے اس قدر متاثر ہوا کہ میرے لئے ایک خاموش تماشائی کا پارٹ اداکرنا مشکل ہوگیا اس لئے میں اصغری بیگم کی بات کاٹ کر بولا۔

"وہ دشمن کون تھا۔؟"

اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں جواب دیا "میں"

"آپ"

"میں نے اس سوال کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس دن میری سولہویں سالگرہ تھی۔ بڑی پُرتکلف چائے تھی۔ میرا ناچ تھا۔ شہر کے تمام اعلےٰ طبقے کے دولتمند تاجر مہمان تھے۔ تقریب کے اختتام پر مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا اور میری پہلی رات کے کرائے کا نیلام شروع ہوا۔ میں دروازے کے پاس کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ پانچسو۔ چھ سو۔ آٹھ سو۔ ایک ہزار۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں باہر نکلی اور سب سے مخاطب ہو کر بولی۔ "معزز مہمانوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں عصمت فروش لڑکی نہیں ہوں میں ایک پڑھی لکھی پاکیزہ خیالات کی لڑکی ہوں۔" میرے باپ کا آہنی پنجہ میرے بازو پر پڑا، مجھے گھسیٹ کر سب سے اندر کمرے میں لے جایا گیا۔ باپ کا ہنٹر کھونٹی سے اترا اور مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک بے بس بے دست و پا بدنصیب لڑکی ہوں۔ جب میں روتے روتے تھک گئی تو میں نے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ وہ ایک ہزار روپیہ ادا کرنے والا تاجر تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں امید کی پہلی کرن نظر آئی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ایک ہفتہ کے اندر اندر اس ماحول سے لے جائے گا۔ اور مجھ سے شادی کرے گا۔"

"پسند تھا وہ آپ کو؟"

"اگلے دو تین دن میں مجھے اس کے بارے میں جو معلومات فراہم ہوئیں وہ بڑی تشویشناک تھیں۔ وہ بلیک مارکیٹ کا بادشاہ اور اسمگلروں کا شہنشاہ تھا۔ اس نے ایک ممتاز سیاسی جماعت کو ایک لاکھ روپے چندہ دیا تھا اور اس کے ٹکٹ پر دس روپے فی ووٹ کے حساب سے قیمت ادا کر کے اسمبلی کا ممبر منتخب ہوگیا تھا۔ اس نے ایک ایکڑ زمین میں صرف اپنے خرچ پر مسجد بنوائی تھی اور اس کے چاروں طرف دکانیں بنا کر ان کو دس دس ہزار روپئے پگڑی لے کر کرائے پر دیا تھا۔ وہ ان پڑھ تھا۔ اس لئے علم کی روشنی پھیلانے کے لئے اس نے ایک خیراتی اسکول اور یتیم خانہ کھولا ہوا تھا۔ جس پر وہ تمام روپیہ لگا دیتا تھا جو خواہ مخواہ حکومت کو انکم ٹیکس کی شکل میں دینا پڑتا۔ اس کی صرف ایک بیوی تھی اور اتنی دولت ہوتے ہوئے صرف ایک بیوی پر اکتفا کر لینا بڑی نامعقول حرکت تھی یہ باتیں بہت تشویشناک تھیں۔ لیکن میری تشویش بے معنی تھی۔ میرے سامنے پسندگی کا سوال نہیں تھا۔ مجھے تو ایک تنکے کا سہارا چاہئے تھا۔ اس کا پیغام آیا کہ وہ دوسرے دن بارہ بجے مجھے لینے آئے گا۔"

"وہ پھر آیا؟"

"دوسرے دن بارہ بجے معلوم ہوا کہ وہ ایک صوبے کا چیف منسٹر ہو گیا ہے!"

"اور اب کہاں ہے وہ؟"

"جیل میں" وہ ہنس پڑی اور میں بھی ہنس پڑا۔

پھر وہ بولی۔ "جب میری ماں کو اور میرے باپ کو میری اسکیم کا پتہ چلا تو ان کی گرفت مجھ پر زیادہ مضبوط ہو گئی۔ لیکن عرصے کے بعد امید کی دوسری کرن نظر آئی۔ میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ میں خوش ہوئی کہ میری ماں راستے سے ہٹ گئی اور اب مجھے اپنا راستہ ڈھونڈنے میں آسانی ہو گی، لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ میرے باپ نے میری ماں کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے اور مجھے تالے میں بند رکھا جانے لگا۔ کچھ مدّت کے بعد امید کی تیسری کرن نظر آئی۔ حکومت نے عصمت فروشی کو ممنوع قرار دے دیا۔ لیکن اس کا بھی کوئی زیادہ فائدہ نہ ہوا۔ اس نے میرے باپ کو اور مجھے دوسرے کروہ جرائم کی طرف دھکیل دیا۔ آج امید کی چوتھی کرن نظر آئی ہے کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔

"آپ سوچتے ہوں گے، میں بہت گندے ماحول میں پلی ہوں، بہت گندے ماحول میں رہتی ہوں۔ اس لئے آپ کے قابل نہیں ہوں، جائیے آرام کیجئے۔"

میں تھوڑی دیر چپ کھڑا رہا۔ پھر بولا۔ "اصغری بیگم آپ کا سوال بہت سنجیدہ ہے اس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔"

"آپ بزدل ہیں۔ آپ کا چھ فٹ لمبا قد، آپ کا چھتیس انچ چوڑا سینہ، آپ کے طاقتور بازو، سب بیکار ہیں۔ آپ کسی مظلوم عورت کی جان بچا سکتے ہیں لیکن اس کی زندگی نہیں بچا سکتے۔ کسی مظلوم عورت کو بچانا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس کی زندگی بچانا بڑی جوانمردی ہے اور آپ وہ ہیں جن کی زندگی میں وہ شرم ناک واقعہ پیش نہ آیا ہوتا اور آپ اس مصیبت زدہ عورت کو جس نے ڈالمیا سمنٹ فیکٹری سے آگے، اس کالی ڈراونی رات کو اس سنسان سڑک پر آپ کو مدد کے لئے پکارا تھا بچانے کے لئے ٹھہر جاتے تو آپ اس کی کوئی مدد نہ کر سکتے۔

کیونکہ وہ عورت آپ کو اپنی حرمت اور جان بچانے کے لئے نہیں پکار رہی تھی۔ اپنی زندگی بچانے کے لئے پکار رہی تھی۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"میں اس عورت کو جانتی ہوں۔"

"اصغری بیگم، وہ عورت کہاں ہے؟ میں اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس سے

ملاسکتی ہیں؟"

"ہاں"

"کون ہے وہ؟"

"میں"

"اصغری بیگم"

"میں پچھلے چھ ماہ سے آپ کا تعاقب کر رہی ہوں۔ میں کراچی کے سب سے بڑے جرائم پیشہ گینگ کی ایجنٹ ہوں۔ ان چھ مہینوں میں کئی دفعہ آپ کی زندگی میرے پیروں کے نیچے آئی۔ لیکن میں زندگی سے محبت کرتی ہوں، میں نے ہر دفعہ آپ کو چھوڑ دیا۔ صرف دو منحوس موقعوں پر گینگ کی پستولوں کی نالیوں کے سامنے مجھے آپ کو موت کے نزدیک لانا پڑا۔ لیکن دونوں دفعہ میرے ذہن میں ایک اسکیم تھی۔ اس سنسان سڑک پر میں نے بکھرے بالوں اور پھٹے کپڑوں والی مصیبت زدہ عورت کا پارٹ ادا کیا کہ شاید آپ کو مجھ پر رحم آجائے اور گینگ کے آنے سے پہلے آپ مجھے کار میں بٹھا کر اس ماحول سے دور کہیں لے جائیں اور آج میں اپنے بہترین لباس میں اور اپنی بہترین رعنائیوں میں آپ کے سامنے آئی ہوں کہ شاید آپ کو مجھ پر پیار آجائے اور آپ مجھے اس ذلت کے غار سے نکال لیں آپ کا کام آسان تھا۔ آپ کو صرف ایک زندگی بچانی تھی۔ میرا کام مشکل تھا مجھے دو زندگیاں بچانی تھیں"

"اصغری بیگم، یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ آپ نے مجھ جیسے ذلیل انسان کی زندگی کو اپنے پیروں کے نیچے کیوں نہ روند ڈالا؟"

اصغری بیگم نے میری طرف بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں اور بولی۔ "چھ ماہ کا عرصہ بڑا قیامت ہوتا ہے ——— اور قیامت کے دن جب کوئی کسی کا نہیں ہوتا، پھر بھی کوئی کسی کا ہو جاتا ہے۔ میرے گینگ کو کچھ معلوم نہ تھا۔ میرا گینگ سمجھتا کہ میں پچھلے چھ ماہ سے آپ کو اس کے جنگل میں پھنسانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آج آپ کی اور میری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد میں آپ کا تعاقب نہ کروں گی۔ اس کے بعد میں اس گینگ کے لئے کام کرنے سے انکار کر دوں گی، اور گینگ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ ظاہر ہے پستول کی گولی! میری موت! خدا حافظ ..... جائیے، آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے۔ آپ سخت خطرے میں ہیں گینگ صرف سورج غروب ہونے کا انتظار کر رہا ہے"

اور حبیب خانقاہ کے پیچھے سے نمودار ہو گئی۔ وہ چلائی۔ "وہ آ گئے۔ جاؤ! خدا کے لئے جلدی جاؤ!"
میں نے کار کا دروازہ کھولا اور اصغری بیگم سے کہا "گھبراؤ مت کار میں بیٹھو! وہ ہمیں نہیں پکڑ سکیں گے۔
وہ گھبرائی ہوئی بولی۔ "نہیں نہیں!! اب میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی، میرے جانے کا وقت نکل گیا ہے، اب وہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانے دیں گے"

میں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اصغری سے جدا نہیں کر سکتی" میں نے اصغری بیگم کو بازو سے پکڑ کر کار میں بٹھا لیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

ڈز! ڈز! ڈز! ڈز! کار کے پہیے ریت میں دھنس گئے۔ اصغری بیگم سخت گھبراہٹ میں بولی۔

"انھوں نے کار پنکچر کر دیا ہے!"

میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں، میرے پاس ریوالور ہے۔"

جیپ میری کار سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئی۔ اصغری بیگم دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں ریوالور لے کر دوسرے دروازے سے باہر نکلا۔ اصغری بیگم رونے گڑگڑانے اور چلانے لگی۔

"ابا! ابا! ان کو چھوڑ دو۔ ان کی جان بخش دو۔ یہ میرے دوست ہیں۔ مجھے ان سے محبت ہے!"

ڈز! ڈز! ڈز! ڈز! — اصغری بیگم ریت اور خون میں ڈھیر ہو گئی۔ میں اس کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھا۔

ڈز! ڈز! ڈز! — پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔

قاضی نذرالاسلام

بنگلہ کہانی
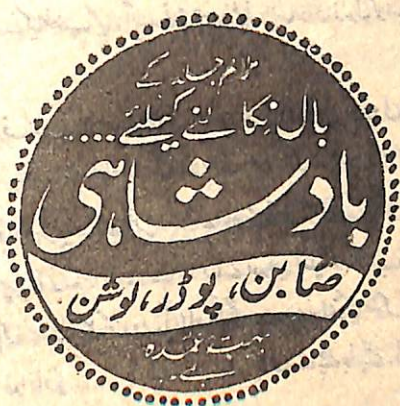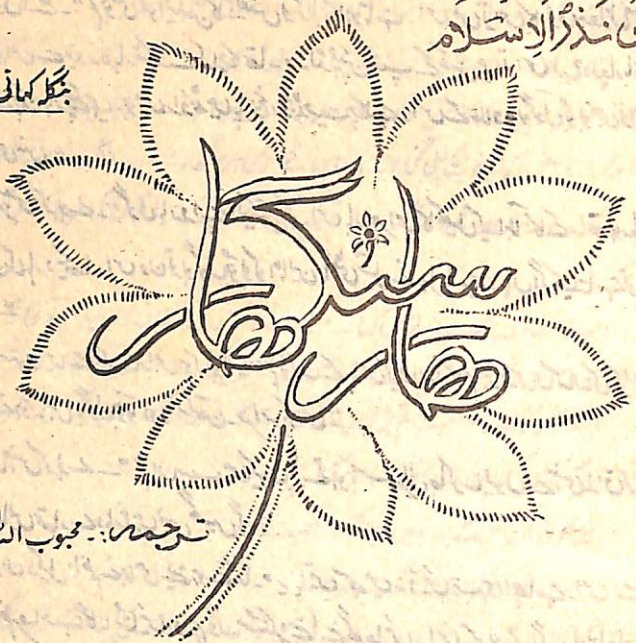
ترجمہ:- محبوب اللہ مجیب

اظہر کلکتہ کے ایک نوجوان اور نامی بیرسٹر تھے۔ اُن کا گھر نوکر، نوکرانیوں، بٹلر، خانساماں، بوائے اور مالی سے بھرا تھا لیکن گھر کی اصل رونق معقود تھی کیونکہ اظہر غیر شادی شدہ تھے۔

نامی بیرسٹر ہونے کے باوجود اظہر آسانی سے کوئی مقدمہ نہیں لیتے تھے۔ سفارش کرنے پر بھی نہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وکالت جاننے کی یہ بھی ایک چال ہے۔ مگر کلکتہ کے شطرنج کھیلنے والے جانتے تھے کہ اظہر کو شطرنج کی چال کے سوا اور کوئی چال پسند نہیں ہے۔

شطرنج میں انھیں آج تک کوئی شکست نہیں دے سکا تھا۔ شطرنج کی محفل والے ان کے دوست جانتے تھے کہ شطرنج نے ہی انھیں ایک کامیاب بیرسٹر ہونے سے روکا ہے۔ اسی نے ان کو اچھا آدمی بھی بنایا ہے۔

بڑے بیرسٹر جب وکیلی نوٹس پڑھتے ہیں، اظہر اس وقت آلیکھن۔ کیپابلانکا۔ آئٹی۔ روبنٹائن اور مرفی کے کھیل کے متعلق سوچتے یا چیس میگزین (chess magazine) پڑھتے اور آنکھیں بند کرکے اس میں لکھی ہوئی چالوں کے بارے میں سوچتے۔

صبح کو تو ممکن نہیں تھا لیکن روز شام کو شطرنج کی محفل جمتی۔ کلکتہ کے زیادہ تر مشہور کھلاڑی وہیں آتے شطرنج کھیلتے اور شطرنج کے متعلق گفتگو کرتے۔ اظہر کو سب سے زیادہ رنج اس بات کا تھا کہ کیپابلانکا جیسا کھلاڑی آلیکھن سے ہار گیا، جبکہ یہی کھلاڑی بوگول جوبو نامی کھلاڑی سے پانچ بار شکست کھا چکا تھا۔ مگر جب آلیکھن سے بڑی گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اظہر نے آج بھی روز کی طرح اس بات پر اظہارِ تاسف

کیا تو مکرجی بول اُٹھے۔ "تم جو بھی کہو آلیکھن کا ڈیفنس تو کمال کا ہوتا ہے۔ اس میں تو اس کا کوئی مقابل نہیں بوگول جو بو تو اس سے پندرہ بار شکست کھا چکا تھا۔ ورلڈ چیمپئن شپ کے کھیل میں تو اس طرح دو چار بازی سبھی ورلڈ چیمپئن ہار چکے ہیں۔ جو بیس راؤنڈ میں پانچ راؤنڈ جیت چکا ہے۔ اس کے علاوہ بوگول جو بو بھی تو ایسا ویسا کھلاڑی نہیں۔"

اظہر ہنس کر بولے۔ "گولی مارو اپنے آلیکھن کو۔ اس بار پھر اس کا کھیل کیسا بلا بکا کے ساتھ ہو رہا ہے اب آلیکھن کی ہار دیکھنا۔ اس دن تو بوگول جو بو کو اٹالین مانٹی سیلی نے ہرایا ہے۔ ہاں اگر کھیلتا ہے تو گران فیلڈ۔"

دوستوں میں سے ایک ناراض ہو کر بولا۔ "تم لوگوں کے پاس کیا دوسرا کام نہیں۔ کہاں کہاں کی بکواس تم لوگ کیے جاتے ہو۔ بس بوگول جو بو اور آلیکھن۔ سراسر بکواس۔"

مکرجی ہنس کر بولے۔ "تم ان سب میں کیوں پڑتے ہو؟ سسرال جا کر سالیوں سے ہنسی مذاق کرو شطرنج کی چالیں تمہارے دماغ میں نہیں گھسیں گی۔"

نوجوان وکیل ناظم نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "یہ باتیں سمجھ میں نہ آئیں تب ہی اچھا ہے۔ اس سے بہتر ہوگا کہ اظہر صاحب گانا سنائیں اور ہم لوگ سن کر اپنے گھر جائیں۔ اس کے بعد تم لوگ بادشاہ اور فرزیں لے کر بیٹھو۔"

شطرنج کے دلدادہ لوگوں کی مخالفت کام نہ آسکی۔ اظہر کو مجبوراً گانا پڑا۔ اظہر بہت اچھی ٹھمری گاتے تھے اور وہ بھی خالص لکھنوی انداز میں۔ گاتے بھی وہ اس درد کے ساتھ تھے کہ سننے والا محو ہو جاتا تھا، مگر وہ آج غزل سنانے لگے۔ ویسے وہ کبھی غزل سنانا پسند نہیں کرتے تھے۔

مکرجی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے۔ صرف غزلیں سنا رہے ہو۔ کیا کوئی حادثہ ہو گیا۔ آج یہ فراق کا گیت کیسا؟"

اظہر نے ہنس کر کہا "ذرا ایک بار باہر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو۔"

سب کی نظریں باہر کی طرف اُٹھ گئیں۔ کچھ دیر پہلے بارش ہو جانے کی وجہ سے آسمان نیلے کنول کی طرح صاف ستھرا تھا۔ اس کے درمیان میں پدمنی جیسا موسم سرما کا چاند، چاروں طرف پھیلے ہوئے جگنو کی طرح تارے اور لیک روڈ کے قریب بنا ہوا خوبصورت سایہ مکان۔ کبھی کبھی اس بڑے کمرے کو رات کی رانی اور ہر سنگھار کی ملی جلی خوشبو معطر کر دیتی تھی۔ سب کے دل و دماغ اس کیفیت سے سرشار ہو گئے۔

ناظم نے سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شطرنج کے مہرے لیکر بیٹھنے سے کیا یہ منظر دکھائی دیتے۔ اظہر نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔"

"یہ ہر سنگھار کے عاشق آج ہمیں شطرنج نہ کھیلنے دیں گے۔" مکرجی بولے

اظہر نے حیرت زدہ ہوکر کہا — "کیا تمہارا بھی ہرسنگھار سے کوئی تعلق ہے"

ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اجیت نے کہا — "چھوڑو بھی یار۔ شطرنج کھیلنے والوں کا بھی کوئی عشق ہوتا ہے ..... ان بیچاروں کا عشق تو صرف اپنی ہی بیوی سے ہوتا ہے — اپنی ہی بیوی سے۔ اور بیوی بھی وہ جو شطرنج سے ناراض ہوکر اپنے میکے چلی گئی ہو — اور اس کے بعد بھی ہرسنگھار" سب لوگ زور سے ہنس پڑے۔

کرجی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا — "تم چپ بھی رہو اجیت، پاگلوں کی طرح کو اس کرنے کو مذاق نہیں کہتے"

اجیت نے غصہ کے سے انداز میں کہا — "میں نے تو بھائی کوئی مذاق نہیں کیا، تم تو سچ مچ اپنی بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لوگ جو کہتے ہیں وہی میں نے بھی کہہ دیا۔ اگر یہ لوگ اس بات پر ہنستے ہیں تو میرا کیا قصور"

اظہر نے ہنس کر کہا — "اجیت تم بڑی زیادتی کر رہے ہو۔ تم نے یہ کیسے مان لیا کہ کسی شطرنج کے عاشق کا اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور سے عشق نہیں ہو سکتا"

"پہلے کرجی اور اس کے بعد تمہیں دیکھ کر" اجیت بولا۔

"ارے میں نے تو شادی ہی نہیں کی" اظہر بولے

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری حالت اور بھی قابل رحم ہے۔ اس بیچارے کو تو زندگی میں عشق کرنے کے لئے بیوی مل گئی ہے مگر تمہارے پاس تو بیوی بھی نہیں ہے" اجیت نے کہا۔

ناظم نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا — "شاباش! اس بار تو آپ نے زوردار بات کہی اجیت بابو"

اسی درمیان میں مالی ہرسنگھار کے پھول کا بنا ہوا دو ہار میز پر رکھ کر چلا گیا۔ اجیت نے ان ہاروں کو بڑی سنجیدگی سے اٹھایا اور ان کو کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ اس کو دیکھ کر سب ہنس پڑے۔ اجیت نے بڑے ڈرامائی انداز میں دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا "اے خوبصورت کھونٹی! سردیوں کی اس تاریک رات میں ہرسنگھار کا یہ ہار —!"

اظہر نے خفیف ہنسی کے ساتھ رکتے ہوئے کہا "اجیت تمہاری قسم! اس ہار کا مذاق نہ اڑاؤ۔ ہار میرے نہیں ہیں"

اجیت معاف کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا — "تب یہ ہار کس کے ہیں؟"

ناظم بول اٹھا — "ابھی تو کہہ رہے تھے کہ شطرنج کے دلدادہ لوگ عشق کر ہی نہیں سکتے"

"میں اسی طرح ہر سال" اظہر کہنے لگا — "کنوار کی پہلی تاریخ کو ہرسنگھار کا ہار پانی میں بہا دیا کرتا ہوں۔ یہ ہار پانی کے لئے ہیں، دوسرے کے لئے نہیں" یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔

شطرنج کھیلنے والوں کی جماعت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اجیت نے بوائے کو بلا کر چائے لانے کے لئے کہا۔ پھر اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے اظہر کی طرف کرسی گھما کر بیٹھ گیا۔ "بتاؤ دوست!" اس نے کہا۔ "آخر بات کیا ہے۔ کیا

کیا تو مکرجی بول اٹھے ۔ " تم جو بھی کہو آلیکھن کا ڈیفنس تو کمال کا ہوتا ہے ۔ اس میں تو اس کا کوئی مقابل نہیں بوگول جو بو تو اس سے پندرہ بار شکست کھا چکا تھا ۔ ورلڈ چیمپئن شپ کے کھیل میں تو اس طرح دو چار بازی سبھی ورلڈ چیمپئن ہار چکے ہیں ۔ جو بیس راؤنڈ میں پانچ راؤنڈ جیت چکا ہے ۔ اس کے علاوہ بوگول جو بو بھی تو ایسا ویسا کھلاڑی نہیں "

اظہر ہنس کر بولے ۔ " گولی مارو اپنے آلیکھن کو ۔ اس بار پھر اس کا کھیل کیسا بلا بکا کے ساتھ ہو رہا ہے اب آلیکھن کی ہار دیکھنا ۔ اس دن تو بوگول جو بو کو اٹالین مانٹی سیلی نے ہرایا ہے ۔ ہاں اگر کھیلتا ہے تو گران فیلڈ "

دوستوں میں سے ایک ناراض ہو کر بولا ۔ " تم لوگوں کے پاس کیا دوسرا کام نہیں ۔ کہاں کہاں کی بکواس تم لوگ کیے جاتے ہو ۔ بس بوگول جو بو اور آلیکھن ۔ سراسر بکواس "

مکرجی ہنس کر بولے ۔ " تم ان سب میں کیوں پڑتے ہو ؟ سسرال جا کر سالیوں سے ہنسی مذاق کرو شطرنج کی چالیں تمہارے دماغ میں نہیں گھسیں گی "

نوجوان وکیل ناظم نے جماہی لیتے ہوئے کہا ۔ " یہ باتیں سمجھ میں نہ آئیں تب ہی اچھا ہے ۔ اس سے بہتر ہوگا کہ اظہر صاحب گانا سنائیں اور ہم لوگ سن کر اپنے اپنے گھر جائیں ۔ اس کے بعد تم لوگ بادشاہ اور فرزیں لے کر بیٹھو "

شطرنج کے دلدادہ لوگوں کی مخالفت کام نہ آسکی ۔ اظہر کو مجبوراً گانا پڑا ۔ اظہر بہت اچھی ٹھمری گاتے تھے اور وہ بھی خالص لکھنوی انداز میں ۔ گاتے بھی وہ اس درد کے ساتھ تھے کہ سننے والا محو ہو جاتا تھا ، مگر وہ آج غزل سنانے لگے ۔ ویسے وہ کبھی غزل سنانا پسند نہیں کرتے تھے ۔

مکرجی نے ہنستے ہوئے کہا ۔ " کیا بات ہے ۔ صرف غزلیں سنا رہے ہو ۔ کیا کوئی حادثہ ہو گیا ۔ آج یہ فراق کا گیت کیسا ؟ "

اظہر نے ہنس کر کہا ۔ " ذرا ایک بار باہر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو "

سب کی نظریں باہر کی طرف اٹھ گئیں ۔ کچھ دیر پہلے بارش ہو جانے کی وجہ سے آسمان نیلے کنول کی طرح صاف ستھرا تھا ۔ اس کے درمیان میں پدمنی جیسا موسم سرما کا چاند ۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے جگنو کی طرح تارے اور لیک روڈ کے قریب بنا ہوا خوبصورت سایہ مکان ۔ کبھی کبھی اس بڑے کمرے کو رات کی رانی اور ہرسنگھار کی ملی جلی خوشبو معطر کر دیتی تھی ۔ سب کے دل و دماغ اس کیفیت سے سرشار ہو گئے ۔

ناظم نے سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا ۔ " شطرنج کے مہرے لیکر بیٹھنے سے کیا یہ منظر دکھائی دیتے ۔ اظہر نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے کہا ۔ " ٹھیک کہتے ہو "

" یہ ہرسنگھار کے عاشق آج ہمیں شطرنج نہ کھیلنے دیں گے " ، مکرجی بولے

اظہر نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کیا تمہارا بھی ہر سنگھار سے کوئی تعلق ہے؟"
ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اجیت نے کہا۔ "چھوڑو بھی یار۔ شطرنج کھیلنے والوں کا بھی کوئی عشق ہوتا ہے ..... ان بیچاروں کا عشق تو صرف اپنی ہی بیوی سے ہوتا ہے۔ اپنی ہی بیوی سے۔ اور بیوی بھی وہ جو شطرنج سے ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی ہو۔ اور اس کے بعد بھی ہر سنگھار۔" سب لوگ زور سے ہنس پڑے۔
مکرجی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ "تم چپ بھی رہو اجیت، پاگلوں کی طرح کو اس کرنے کو مذاق نہیں کہتے۔"
اجیت نے غصہ کے سے انداز میں کہا۔ "میں نے تو بھائی کوئی مذاق نہیں کیا، تم تو سچ مچ اپنی بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لوگ جو کہتے ہیں وہی میں نے بھی کہہ دیا۔ اگر یہ لوگ اس بات پر ہنستے ہیں تو میرا کیا قصور۔"
اظہر نے ہنس کر کہا۔ "اجیت تم بڑی زیادتی کر رہے ہو۔ تم نے یہ کیسے مان لیا کہ کسی شطرنج کے عاشق کا اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور سے عشق نہیں ہو سکتا۔"
"پہلے مکرجی اور اس کے بعد تمہیں دیکھ کر۔" اجیت بولا۔
"ارے میں نے تو شادی ہی نہیں کی۔" اظہر بولے
"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری حالت اور بھی قابل رحم ہے۔ اس بیچارے کو تو زندگی میں عشق کرنے کے لئے بیوی مل گئی ہے مگر تمہارے پاس تو بیوی بھی نہیں ہے۔" اجیت نے کہا۔
ناظم نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "شاباش! اس بار تو آپ نے زوردار بات کہی اجیت بابو۔"
اسی درمیان میں مالی ہر سنگھار کے پھول کا بنا ہوا ڈوہار میز پر رکھ کر چلا گیا۔ اجیت نے ان ہاروں کو بڑی سنجیدگی سے اٹھایا اور ان کو کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ اس کو دیکھ کر سب ہنس پڑے۔ اجیت نے بڑے ڈرامائی انداز میں دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اے خوبصورت کھونٹی! سردیوں کی اس تاریک رات میں ہر سنگھار کا یہ ہار ——!"
اظہر نے خفیف ہنسی کے ساتھ رکتے ہوئے کہا۔ "اجیت تمہاری قسم! اس ہار کا مذاق نہ اڑاؤ۔ ہار میرے نہیں ہیں۔"
اجیت معاف کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "تب یہ ہار کس کے ہیں؟"
ناظم بول اٹھا۔ "ابھی تو کہہ رہے تھے کہ شطرنج کے دلدادہ لوگ عشق کر ہی نہیں سکتے۔"
"میں اسی طرح ہر سال۔" اظہر کہنے لگا۔ "کنوار کی پہلی تاریخ کو ہر سنگھار کا ہار پانی میں بہا دیا کرتا ہوں۔ یہ ہار پانی کے لئے ہیں، دوسرے کے لئے نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔
شطرنج کھیلنے والوں کی جماعت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اجیت نے بوائے کو بلا کر چائے لانے کے لئے کہا۔ پھر اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے اظہر کی طرف کرسی گھما کر بیٹھ گیا۔ "بتاؤ دوست!" اس نے کہا۔ "آخر بات کیا ہے۔ کیا

کوئی سنجیدہ مسئلہ ہے۔ کنوار کی پہلی تاریخ۔ ہرسنگھار کے پھول کا ہار۔ پانی میں بہایا جانا۔ یہ تو بہت خوبصورت کہانی ہوگی۔ سُناؤ نا!۔ نہیں تو ہم سب لوگ ستیاگرہ شروع کر دیں گے۔"

سارے لوگ ہنسنے لگے۔ اور اجیت کے تجویز کی تائید کی۔ اظہر نے بہت زور دینے پر ہنس کر کہا۔

"لیکن اس کی شروعات بھی شطرنج کے کھیل سے ہی ہے۔"

اجیت بڑے حوصلے سے بولا۔ "اس مکمل کہانی کی چاہت میں اس حصے کو بھی سُن لیں گے۔"

اس پر مکرجی ہنس کر بولے۔ "شطرنج کے اس کھیل میں اونٹ کی قسط ہی زیادہ رہے گی۔ ہاتھی گھوڑے تو سب مر مٹ جائیں گے۔ ڈرنے کی بات نہیں۔"

سبھی لوگوں نے پھر چائے پی۔ اس کے بعد اظہر نے سگار جلا کر دو تین کش لیتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں نئی نئی بیرسٹری پاس کر کے آیا تھا اور شیلانگ گھومنے گیا تھا۔ بھادوں کا مہینہ تھا اور پوجا کی چھٹی میں آنے والے لوگوں نے بھی آنا شروع نہیں کیا تھا۔ پھر بھی دو ایک لوگ پہلے سے ہی آگئے تھے۔ مجھے بچپن سے ہی شطرنج کھیلنے کا شوق تھا۔ ولایت جا کر یہ شوق اور بھی بڑھ گیا۔ وہاں پر اٹیس، میچل، ونٹر اور ٹامس جیسے نامی کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اور کیمبرج کو ریپریزینٹ کرتے ہوئے میں نے کئی بازیاں جیتی تھیں۔ شیلانگ جانے اور وہاں پر کھیلنے کے بعد دو ایک شطرنج کے کھلاڑیوں سے میرا تعارف ہوگیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اچھا کھلاڑی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ہی مجھ سے ہارتے تھے۔ ایک دن ان ہی میں سے ایک نے مجھ سے کہا۔ "یہاں پر ایک بوڑھے اور ریٹائرڈ پروفیسر ہیں، جو شطرنج کے بہت بڑے کھلاڑی ہیں۔ انھیں کوئی ہرا نہیں سکتا آپ ان کے پاس چلیئے۔"

میں نے اسی وقت اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی چلیے وہ کہاں رہتے ہیں۔"

"چلیے نا!" اس بھلے آدمی نے کہا۔ "چلتا ہوں۔ آپ جیسا کھلاڑی دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گے۔ انھیں بھی آپ ہی کی طرح شطرنج کھیلنے کا نشہ ہے۔ وہ بڈھا بہت اچھا کھلاڑی ہے اور آنکھ پر پٹی باندھ کر بھی کھیل سکتا ہے۔"

میں نے یورپ میں بہت سے لوگوں کا "بلائنڈ فولڈڈ" کھیل دیکھا تھا اور خود بھی کھیل چکا تھا، اس لئے متعجب نہیں ہوا۔ وہ ایک گھڑی — شام تھی اور آسمان میں پتلا سا چاند نکلا تھا — شاید نیا چاند تھا جیسے کسی نئی امید کا ضامن ہو۔ سارے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، جس کے بیچ چاند اور تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ یوکلپٹس اور دیودار سے گھرے ہوئے ایک خوبصورت بنگلے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ساٹھ سالہ عمر کا ایک ضعیف مگر سنجیدہ اور پُروقار آدمی ایک جوان عورت کے ساتھ بیٹھا شطرنج کھیل رہا ہے۔ ہم لوگوں کے ملک میں عورتیں بھی شطرنج کھیلتی ہیں۔ یہ میں نے پہلی بار دیکھا۔ عقیدت اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میں نے اُس نوجوان عورت کو دیکھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "— پاپا! دیکھو تو کون لوگ آئے ہیں۔"

کھیل ختم ہونے کے پہلے ہی لڑکی کو اُٹھتے دیکھ کر اُس ضعیف آدمی نے ہم لوگوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ لیکن

دوسرے ہی لمحہ ہنسکر بولے ۔ "ارے وینے بابو! یہ کون ہیں؟ آؤ بیٹھو۔ آپ کی تعریف؟" وہ بولے "چیس
وینے بابو جو مجھے لے گئے تھے جوں ہی میرا تعارف کرایا اُس ضعیف آدمی نے مجھے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔
"آپ ہی کا نام اظہر ہے؟ وہ بولے چیس میگزین اور اخباروں میں آپکا نام تو بہت دیکھا ہے۔ آپ تو بہت بڑے
کھلاڑی ہیں۔ ایٹس کے ساتھ برابر کی بازی رہی۔ یہی کیا کم ہے اور آپ کی پھر ابھی عمر ہی کیا ہے۔ آپ سے
ملکر بڑی خوشی ہوئی۔ بہت ہی خوشی۔ ارے بیٹی، ہرسنگھار" دیکھو تو شطرنج کے کتنے بڑے کھلاڑی آئے ہیں۔
انھیں آکر دیکھو! اب تو دن بہت اچھے گزریں گے۔ اس عمر میں بھی مجھے شطرنج کھیلنے کا اس قدر شوق ہے کہ
اگر کوئی نہیں ملتا تو اپنی لڑکی کے ساتھ ہی کھیلتا ہوں۔" یہ کہکر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "انھوں نے تو
ہر سکون شام کو بارونق کر دیا۔"

ہرسنگھار نمستے کر کے خاموشی سے اپنے باپ کے بغل میں بیٹھ گئی۔ اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ بیچ
بیچ ہرسنگھار کا پھول ہے۔

ڈوبتے ہوئے زرد آفتاب کی سی رنگت والی ساڑی میں سے اس کا حسین چہرہ اسی طرح جھانک
رہا تھا جیسے زرد رنگ کے ڈنٹھل میں سے ہرسنگھار کا پھول۔ میری آنکھیں اس پر شاید کافی دیر تک جمی
رہیں۔ بوڑھے کی بات سُن کر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ وہ شاید کھیل کے لئے بیقرار تھے۔ نوکر نے چائے کا سامان رکھا
اس کے جاتے ہی ہرسنگھار نے چائے بناتے ہوئے ہنس کر کہا ۔ "پاپا سے شاید یہ دیر برداشت نہ ہو"
پھر میری طرف دیکھتی ہوئی بولی ـــــ "اب چائے پیتے پیتے کھیل شروع کیجئے۔ ہم لوگ دیکھیں گے؟"
وینے ہنس کر بولے ۔ "ہاں اب کھیل برابر کا ہے۔ سُن رہی ہیں مس چودھری! مجھے یہ روز ہرا
دیتے ہیں۔"

کھیل شروع ہوا۔ سبھی لوگ بے چینی سے دیکھنے لگے۔ کوئی بیچ میں چال بھی بتا دیتا۔ مس چودھری یعنی
ہرسنگھار نے اپنے باپ کو دو ایک ایسی چالیں بتائیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح اچھا کھیلتی
ہے۔ کچھ دیر کھیلنے کے بعد ہی میں سمجھ گیا کہ یورپ میں جن لوگوں کے ساتھ کھیل چکا ہوں ان میں سے کئی کھلاڑیوں
سے بہتر پروفیسر چودھری کا کھیل ہے۔ پروفیسر چودھری کو میں ایک بڑے کیمسٹ کی حیثیت سے جانتا تھا۔
لیکن وہ اتنا اچھا شطرنج بھی کھیلتے ہیں۔ یہ نہیں جانتا تھا۔

میں نے ایک پیادہ مار دیا تو بوڑھے نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے ڈیفنس کا کھیل شروع کر دیا۔ انھوں نے
میری فیل والی چال کی بہت تعریف کی۔ ہرسنگھار میری طرف بار بار حیرت اور تعریف بھری نظروں
سے دیکھنے لگی۔ لیکن ایک مہرہ کم ہوتے ہوئے بھی بوڑھا اتنا اچھا کھیل رہا تھا کہ میں نے شکست کے ڈر سے
کھیل کو بغیر ہار جیت کے ختم کر دیا۔ بوڑھا بار بار میری تعریف کرتے ہوئے بولا۔
"دیکھو بیٹی ہرسنگھار! ہم لوگ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ فیل گھوڑے کی طرح نہیں کھیل سکتا۔

فیل کی جوڑی نے کیا کمال دکھلایا۔ تم بہت اچھا کھیلتے ہو۔"

"بھائی! میں یا تو ہارتا ہوں اور یا ہرتا ہوں۔ کوئی کھیل میرا آسانی سے بغیر ہار جیت کے ختم نہیں ہوتا۔"

"آپ کتنے سالوں سے نہیں ہارے پاپا؟" ہرسنگھار نے ہنستے ہوئے کہا۔

پروفیسر چودھری نے ہنستے ہوئے کہا۔ "نہیں بیٹی! ہارا ہوں۔ تقریب پندرہ سال پہلے گاؤں کے ایک آدمی نے جو بالکل ہی ان پڑھ تھا۔ اس جیسا کھلاڑی میں نے دوسرا نہیں دیکھا۔"

پھر کھیل شروع ہوتے ہی دینے نے ہنس کر کہا۔ "آپ اظہر صاحب کے ساتھ کھیلئے نا مسٹر چودھری!"

بوڑھا خوش ہوکر بولا۔ "ٹھیک تو ہے۔ تم ہی کھیلو نا بیٹی! میں دیکھتا ہوں۔"

ہرسنگھار شرماتے ہوئے بولی۔ "میں ان کے ساتھ کیا کھیل سکوں گی؟" لیکن سب کے اصرار پر وہ کھیلنے بیٹھ گئی۔ ایک طرف ہرسنگھار دوسری طرف میں اور بیچ میں شطرنج کی بساط۔ اور اس پر اس کے بالوں کی خوشبو جو میرے دل و دماغ پر چھا رہی تھی اور میرے جسم پر نشہ طاری کر رہی تھی دو ایک بار غلط چال چلنے پر ہرسنگھار نے میری طرف دیکھ کر نظریں جھکائیں اُس کے ہونٹوں کے کنارے پر ہنسی آ کر رک سی گئی تھی۔ وہ بڑی ہی بامعنی ہنسی تھی۔

پھر بھول کرتے ہی میرا ایک رُخ مارا گیا۔ بوڑھا بہت حیران ہوا۔ دینے بابو ہنستے ہوئے بولے۔ "اب اظہر صاحب کو مات ہی ہوگی۔" مجھے محسوس ہوا جیسے ان کی ہنسی میں طنز ہو۔

میں اب چوکنا ہوکر دھیان سے کھیل کھیلنے لگا۔ دونوں فیل اور وزیر کو آگے بڑھا کر ایسا آفنسیو کھیل کھیلنے لگا کہ پروفیسر چودھری بھی بازی نہ بچا سکے۔ ہرسنگھار ہار گئی۔ وہ اگرچہ ہار گئی تھی پھر بھی اتنا اچھا کھیل کھیل رہی تھی کہ میں اُس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کہا۔ "دیکھئے میں عورتوں کی "ورلڈ چیمپین" مس مینچک کے ساتھ بھی کھیلا ہوں لیکن مجھے اتنے دھیان سے نہیں کھیلنا پڑا۔ میں تو قریب قریب ہار ہی گیا تھا۔"

میں نے دیکھا کہ ہرسنگھار کنول کے پھول کی طرح سرخ ہو گئی۔ مجھے خوشی ہوئی۔ وہ ہار کر بھی مجھ سے کبیدہ خاطر نہ ہوئی۔ اسے میں نے اپنی خوش قسمتی جانا۔

پروفیسر چودھری کے ساتھ پھر کھیل شروع ہوا جو اس بار بھی برابر رہا۔ اُن کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ بولے ہاں۔ "اتنے دن بعد ایک کھلاڑی ملا ہے جس کے ساتھ کھیلنے پر آٹھ بار سوچنا پڑتا ہے۔"

اب یہ طے ہوا کہ روز پروفیسر چودھری کے یہاں محفل جمے گی۔

اُٹھتے وقت بوڑھے پروفیسر نے کہا۔ "اتنی دیر کھیلنے سے اظہر صاحب تھک گئے ہوں گے۔ انھیں ایک گانا سناؤ۔" میں فوراً ہی اُٹھ بیٹھا۔ "واہ کیا تجویز ہے۔"

ہرسنگھار نے دبی آواز میں کہا۔ "میں ابھی اچھی طرح گانا نہیں جانتی کیونکہ کچھ ہی دن سے تو سیکھنا شروع کیا ہے۔"

ہم لوگوں کے سامنے ہرسنگھار کا عذر کام نہ آسکا۔ آخر اسے گانا پڑا۔ گیت جس نے بھی لکھا ہو لیکن مجھے محسوس ہوا کہ یہ اس کے روح اور دل کی آواز ہے۔

کچھ لوگوں کی آواز ایسی ہوتی ہے کہ اسے سُن کر یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اچھا ہے یا بُرا۔ اس آواز میں اتنا درد اور اتنی کشش ہوتی ہے کہ سُننے والا تعریف تک کرنا بھول جاتا ہے۔ ایسی آواز چاہے جیسی بھی ہو دل کے تاروں کو جھنجنا دیتی ہے۔ تعریف منہ سے نہ بھی کی جائے آنکھوں سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ ویسی ہی آواز تھی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ کچھ کہہ نہ سکا۔ میرے منہ سے حرف اتنا ہی نکلا۔ "بہت خوب" اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ ہرسنگھار نے میری آنکھوں میں پانی کے قطرے دیکھے۔ اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں استعجاب لئے اس کا مطلب سمجھنے لگی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا ہوگا۔ کاش میں سمجھ سکتی کہ روشنائی کی تحریر مٹ جاتی ہے اور پانی کی تحریر نہیں مٹ پاتی۔"

اس دن میرے بارے میں کسی نے کیا سوچا تھا، میں نے اُس دن غور کیا اور نہ آج غور کرتا ہوں مگر سوچتا ہوں کہ ہرسنگھار کا پھول اگر گیت گا سکتا تو اسی طرح گاتا۔ اس کے گلے میں کتنا درد تھا اور آواز میں کتنا بہاؤ۔ اُس نے جو کچھ گایا وہ ٹھمری اور ٹپہ کے دھن میں تھا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ اس نے گانا ابھی ٹھیک سے نہیں سیکھا ہے۔ گلے کی آواز تو قدرتی دین تھی۔ کنول کا پھول جس طرح بغیر جانے ہوئے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی پنکھڑیوں کو سینچتا ہے اُسی طرح ہرسنگھار بھی تھی۔

گانا ختم ہونے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ "اگر آپ ٹھمری سیکھیں تو سارے ملک میں آپ کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ آپ کی آواز بڑی ہی سریلی ہے۔"

ہرسنگھار کے پھول کی شاخیں جس طرح چاندنی میں دلکش ہو جاتی ہیں اُسی طرح سے ہرسنگھار بھی انبساط و حیا کے یکجا ہونے سے حسین نظر آرہی تھی۔

ہرسنگھار نے حیا کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "نہیں میری آواز کچھ بھونڈی ہے۔ اچھا رہنے دیجئے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ بھی گانا جانتے ہیں۔ اگر جانتے ہوں تو سنائیے۔"

میں قدرے مشکل میں پڑ گیا۔ ایک بار تو سوچا کہ نہیں کر دوں۔ لیکن گانا سُن کر خود میرا بھی گانے کے لئے جی چاہ رہا تھا۔ لیکن میں نے کہا کہ گانا تو ٹھیک نہیں جانتا صرف سمجھ لیتا ہوں اور جو گانا بھی جانتا ہوں تو وہ بھی ہندی میں ہے۔

پروفیسر چودھری خوش ہو کر بول اُٹھے۔ "واہ! پہلے سے بتانا تھا۔ تمہارا ہی گانا پہلے سنا جاتا۔ اور سچ پوچھو تو گانا اگر ہندی میں نہ ہو تو مزہ نہیں آتا۔ ہندی ہی گانوں کی زبان ہے۔ بنگلہ تو کلاسیکل موسیقی کی زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ بھجن اور کیرتن کے علاوہ تو اس زبان پر کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔"

میں نے کہا۔ "اگرچہ میں بنگلہ گانے نہیں جانتا پھر بھی بنگلہ زبان کی طرف سے اتنا مایوس نہیں۔ میں نے

گانا گایا۔ پروفیسر چودھری نے تو مجھے پکڑ ہی لیا۔ انھیں کل سے گانا سکھانا ہوگا۔ ہرسنگھار کی آنکھوں میں پسندیدگی تھی۔ وینے بابو اور ان کے ساتھ کے لوگ ایسا ہی گانا سننا چاہتے تھے۔ ان کے اصرار پر دو چار خیال اور ٹپہ گانے پڑے۔ پروفیسر چودھری کی تعریف کے درمیان تو آدھے گانے ہی سنے جا سکے۔ سب سے آخیر میں میں نے ٹھمری گائی۔

گانا ختم ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ ہم لوگوں کے پیچھے کچھ اور بھی عورتیں کھڑی تھیں۔ ہرسنگھار نے تعارف کرایا۔ "یہ میری ماں ہیں اور یہ میری ممانی اور باقی میری چھوٹی بہنیں۔

—— دوسرے دن دوپہر کو میں پروفیسر چودھری کے یہاں مدعو تھا۔ رخصت ہوتے وقت ہرسنگھار سے نمستے کرتے ہوئے آنکھیں ملیں اور جلنے لگیں میں نے سوچا کہ ایک تنکا پڑ جانے سے جب آنکھیں اتنا کرکراتی ہیں تو آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے کیا کچھ نہیں ہوگا، جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

میں ڈیڑھ مہینہ تک شیلانگ میں رہا۔ ایک ہفتہ بعد ہی مجھے ہوٹل چھوڑ کر پروفیسر چودھری کے یہاں منتقل ہونا پڑا۔ میرے وہ دن بڑے آرام سے گزرے۔ شطرنج کھیلنا اور گانا گانا۔

یہاں آکر میں مشکل میں پڑ گیا۔ پروفیسر چودھری کے ساتھ شطرنج تو کھیلنا ہی تھا لیکن گانا سکھانا میرے لئے مشکل کام تھا۔

ہرسنگھار بھی مجھ سے گانا سیکھنے لگی۔ کچھ دن بعد میرے گانوں کی ساری پونجی ختم ہوگئی۔ اب محسوس ہوا کہ گانا سیکھنا سوارت ہوگیا۔ جو کچھ بھی سیکھا تھا سب اسے دیدیا۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو "مالا" تو نہیں پہنائی اور شاید اس زندگی میں پہنا بھی نہ سکیں لیکن ایک دوسرے سے آواز تو ضرور بدل لی، رہی دل کی بات تو وہ دل ہی جانتا ہے۔"

اجیت نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "بھئی! صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ پیار کی ڈور میں بندھ گئے۔"

اظہر نے بغیر جواب دیئے سگار جلایا اور کہنا شروع کیا۔ "ایک دن صبح ہرسنگھار کی آواز سے نیند ٹوٹ گئی۔ وہ گا رہی تھی۔

"اب میرا وقت ہوگیا،

جانے کے لئے دروازہ کھول دو"

گانا سُن کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے انگ انگ میں درد ہو رہا ہے۔ کوشش کرنے کے باوجود اٹھ نہ سکا آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس نے اپنے گیت میں دل کی ساری آرزوئیں بھر دی تھیں۔ مجھے آج پہلی بار ہرسنگھار کی آواز اجنبی سی لگی۔

قدموں کی آہٹ ہوئی، میں نے گھوم کر دیکھا۔ ہرسنگھار اپنے ہاتھوں میں ہرسنگھار کے پھول لے کر کسی پجارن کی طرح میز پر رکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

نظریں ملتے ہی اُس نے آنسوؤں کو مجھ سے چھپائے بغیر پوچھا۔ "کیا آپ کل ہی جا رہے ہیں؟" جواب دینے سے پہلے ہی میری آواز بھر آئی۔ میں نے اپنی ساری توانائیوں کو اکٹھا کر کے اور اپنی دھڑکنوں کو یکجا کرتے ہوئے کہا "ہاں" آگے کچھ اور بھی کہنے جا رہا تھا لیکن جو کہنا چاہتا تھا بھول گیا۔

مس چودھری نے ہرسنگھار کے پھولوں کو مٹھی میں لے کر اپنے سرخ ہونٹوں اور پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا ۔ "اب آپ کب آئیں گے؟"

میں نے بے کیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ابھی یہ بھی نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے کبھی آؤں"

ہرسنگھار پھولوں کو رکھ کر چلی گئی۔ پھر کچھ بھی نہیں پوچھا۔

میرا دل جیسے پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا ہو۔

نادان! تیری زندگی میں پل بھر کے لئے یہ خوبصورت گھڑی آئی تھی پر تو نے اسے کھو دیا۔ تیری زندگی میں دوبارہ پھر کبھی ایسا حسین لمحہ نہیں آئے گا۔

میں ایک مہینہ تک ان لوگوں کے گھر میں رہا۔ کتنا پیار، کتنی عزت اور کتنا آرام دیا اُن لوگوں نے مجھے۔ بغیر روک ٹوک کے ملنا جلنا۔ نہ ہی کسی قسم کی پابندی اور نہ ہی کسی قسم کا اندیشہ۔ شاید یہی آزادی ہم لوگوں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ کسی نے بھی کسی کے دل کی کیفیت جاننے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی سوال یا تجسّس بھی دل میں پیدا نہیں ہوا۔ ایک لامحدود آسمان اور دوسرا اتھاہ سمندر۔ کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ بس دونوں ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔

کسی نے روک ٹوک نہیں کی۔ کوئی آکر راستہ میں کھڑا نہیں ہوا۔ وہ جیسے جانتی ہو کہ مجھے جانا ہی ہوگا۔ میں بھی جیسے جانتا تھا کہ مجھے لوٹنا پڑے گا۔ ندی کا سکوت ہی گویا ایک حقیقت ہو۔ دونوں کنارے مجبور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کوئی آرزو نہیں۔ اگر ہے تو صرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے رہنا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میز پر رکھے ہارسنگھار کے پھولوں کو دونوں ہاتھوں میں لیکر میں ہونٹوں تک لے گیا۔ شاید غیر شعوری طور پر میں نے ان پھولوں کو پیشانی سے لگا لیا۔ اور پھر میز پر رکھ دیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ پھول کسی پجارن نے دیئے ہیں۔ محبوبہ نے نہیں۔ یہ سوچتے ہی دل بیٹھنے لگا۔ آنکھیں اُٹھا کر دیکھا روز کی طرح ہنستے ہوئے ہرسنگھار کہہ رہی تھی۔

"آج گانا نہیں سکھایئے گا؟"

میں نے کہا "چلو! آج تو آخری دن ہے"

ہرسنگھار اپنی نرگسی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ شاید ڈر کی وجہ سے ہی میں نے

اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جیسے چھوئی موئی کا پھول تھی اور میں جیسے صبح کی ٹھنڈی ہوا۔ جتنی محبت اتنا ہی خوف۔ جیسے وہ چھوتے ہی مٹی میں گر پڑے گی۔ جیسے وہ پریوں کے دیش کی کوئی شہزادی ہو جو خواب سے آنکھیں کھلتے ہی غائب ہو جائے گی۔ یا جیسے کوئی دلفریب سراب ہے جو پکڑنے کی کوشش سے ہوا میں گم ہو جائے گا۔

میں نے اُسے گانا سکھایا۔ جدائی کے نغموں کے علاوہ اور سارے گیت، کیونکہ میں جانتا تھا کی فراق کی گھڑیاں تو آئیں گی ہی پھر اس کے بارے میں باتیں کر کے ماحول کو افسردہ کیوں کیا جائے۔

اُس دن کی شام ایک ویران، تنہا اور سوگوار شام تھی۔ بغیر بادلوں والی اداس اور غمگین۔ میں نے پروفیسر چودھری سے کہا "آج کی شام تو بالکل سادے لباس میں ہے۔ کسی طرح کا بناؤ سنگھار نہیں ــــ"

میرے کہتے ہی جیسے منہ کی بات چھین کر پروفیسر چودھری بول اُٹھے۔

"شام آج بیوہ ہو گئی ہے ــــ"

ایسی ہی باتوں سے ان کے جذبات کو سمجھنے میں مدد ملتی تھی۔ میں نے جان لیا کہ اس پُر سکون اور سنجیدہ شخص کے دل میں بھی آندھی اُٹھی ہے۔ دل میں کہا "تم اٹل پہاڑ ہو۔ تمہارے قدموں کے نیچے بیٹھ کر دھیان لگانا چاہئے۔ تمہیں آندھی نقصان نہیں پہونچا سکتی۔"

پروفیسر چودھری شاید میرے دل کی بات سُن رہے تھے، سنجیدگی سے ہنستے ہوئے بولے۔

"میں بہت حقیر ہوں بھائی۔ پہاڑ نہیں ایک ٹیلہ ہوں، لیکن تم لوگوں کی عقیدت دیکھ کر سربلند پہاڑ بن جانے کی خواہش ضرور ہوتی ہے"

میرے کچھ کہنے سے قبل ہی ہر سنگھار ہم لوگوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اچانک میرے منہ سے نکل پڑا "یہی تو ہے شام کی دیوی ــــ" مگر میں کہنے کے ساتھ ہی شرمندہ ہو گیا۔

ہر سنگھار کا سنہرا بدن اس دن لال ساڑی میں لپٹا ہوا تھا۔ اسے لال ساڑی میں آج پہلی بار میں نے دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پورے آکاش کو رنگ کر شام آج مجسم زمین پر اُتر آئی ہے ہر سنگھار کے جسم پر خون کی لہروں کے رنگ کی ساڑی۔ دل میں خون کی لہر۔ چہرہ پر آنے والی رات کا اداس سایہ میں نے آنکھیں جیسے ہی بند کیں دل میں بانسری سی بجنے لگی۔

ہر سنگھار سے دو ایک بنگلہ گیت سیکھے تھے۔ میں نے کہا

"ایک گیت سُناؤں ــــ"

ہر سنگھار میرے پیروں کے پاس گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولی "سُنائیے ــــ"

میں نے گیت شروع کیا "شادی کے رنگ سے رنگین ہو گیا ہے

سونے کا آکاش رے"

پروفیسر چودھری اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ جاتے وقت کہہ گئے دیکھو بھائی آج آخری بار پھر ایک دفعہ شطرنج کھیلنا پڑے گا ۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کہا

"اچھا ہرسنگھار پھر جب کنوار کا مہینہ آئے اور ایسی ہی شام ہو تو کیا کروں بتا سکتی ہو ؟"

ہرسنگھار کی بڑی بڑی آنکھوں نے ہی جیسے میری آنکھوں سے سب کچھ کہہ دیا ۔ اس کے بعد رُک رُک کر اس نے کہا ۔ " ہرسنگھار کے پھولوں کی مالائے کر پانی میں بہا دیا کرنا ۔"

میں نے مختصر سا جواب دیا " ایسا ہی ہوگا ۔" پھر پوچھا " تم کیا کروگی ۔۔ ؟

اُس نے ہنس کر کہا ۔ " کنوار کے آخر میں تو ہرسنگھار ختم ہو جاتے ہیں ۔۔"

ہم لوگوں کی بھیگی آنکھوں میں شام کا تارا جھلملانے لگا ۔

رات کو پھر شطرنج کی محفل جمی پروفیسر چودھری مجھ سے ہار گئے ۔ میں ہرسنگھار سے ہار گیا زندگی میں یہی میری پہلی اور آخری ہار تھی اور یہی ہار میرے لئے گلے کا ہار بن کر رہ گئی ۔

صبح میں جب رخصت ہوا تو اس وقت ہرسنگھار کے بنگلے کے چاروں طرف کے پیڑ کہرے میں ڈھکے ہوئے تھے ۔

پھر ہرسنگھار سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور کبھی ہوگی بھی نہیں ۔

وہ میرے اتنے قریب رہتی ہے کہ ہاتھ بڑھاتے ہی اسے چھو سکتا ہوں ، لیکن پھر بھی چھونے کی جرأت نہیں ہوتی ۔

ہرسنگھار بہت نازک ، بہت کومل ہوتا ہے ۔ گلے میں پہنتے ہی مرجھا جاتا ہے ۔ اسی لئے کنوار کے مہینے میں چپ چاپ ہرسنگھار کا ہار گوندھ کر پانی میں بہا دیتا ہوں ۔

٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ....؟!

سترہ سال کی عمر میں میں خوبصورتی کا مکمل نمونہ تھی ـــــ میرا جسم متناسب تھا، قد لمبا لمبا، ہاتھ پاؤں صندلیں، آنکھیں شراب کے پیالے ـــ رنگت ایسی جیسے کسی نے میدہ گلابی پانی سے گوندھ کر رکھ دیا ہو ـــ تم اگر اسے خود ستائی نہ کہو تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ میں نے دنیا میں خود سے زیادہ حسین شکل کوئی نہ دیکھی ـــــ اور میرے اُس حُسن کا مول بھی بہت اونچا تھا۔

میری منگنی شہر کے ایک بہت بڑے رئیس کے ولایت پلٹ لڑکے سے ہو چکی تھی اور اسی لئے بھائی میاں مجھے بڑی سرگرمی سے چھری کانٹے سے کھانا کھانا سکھا رہے تھے ـــــ کبھی کبھی میں کانٹا زبان میں چبھا لیتی ـــــ یا چھری اس بے دردی سے ڈبل روٹی پر چلاتی کہ میری انگلی کٹ جاتی اور نتیجے میں بھائی جان میرے سر پر ایک آدھ دھول جڑ دیتے ـــــ اُنھوں نے ہزار بار بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ کانٹے میں اٹکے روٹی یا گوشت کے ٹکڑے کو، دانتوں کی مدد سے بڑی آہستگی سے زبان پر اتار لینا چاہئے، مگر میں اکثر کانٹا اس انداز سے مُنہ میں رکھتی کہ زبان میں چبھ چبھ جاتا ـــــ مگر کانٹے کی یہ چبھن بھی بھلی لگتی ـــــ یہ سب کچھ میں اپنی نئی زندگی میں داخل ہونے کے لئے ہی تو سیکھ رہی تھی نا ـــــ؟؟

جب بھائی میاں مجھے کھانا کھانا سکھا رہے ہوتے، دالان میں اماں بیٹھی خشمگیں نگاہوں سے

مجھے گھورے جائیں

جس گھرانے میں میری بات لگی ہوئی تھی، وہ گھرانا بڑا فارورڈ تھا ـــــ وہاں کے سارے طور طریقے بالکل انگریزوں کے سے تھے، اماں ڈرتی تھیں کہ میں نے اپنی نادانی کی وجہ سے اگر کوئی اُلٹ پلٹ بات کر دی تو اتنا اچھا رشتہ ہاتھوں سے نکل جائے گا ـــــ ! ولایت پلٹ لڑکے بھلا کوئی روز روز ملتے ہیں جی ـــــ ؟ (تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ـــــ ؟)

میں سوچتی اماں کے خدشے بھی بے بنیاد تو نہیں ہیں ـــــ کانچ کے نازک اور خوبصورت کھلونے کو کوئی ٹھوکر مار دے تو کیا انجام ہوتا ہے ـــــ ؟ وطن میں ہماری زندگی بھی تو ایسی ہی نازک نازک خوبصورت کانچ کے کھلونے ایسی تھی ـــــ وقت کی مضبوط ٹھوکر پڑی اور کھلونا چکنا چور تھا ـــــ پرانی زندگی کی یاد کو لے کر اب کرنا بھی کیا تھا ـــــ وہ ساری خوشیاں اور ولولے تو سرد پڑ گئے تھے ـــــ اب تو پیٹ کی آگ تھی اور کچھ نہیں ـــــ جسے کسی نہ کسی صورت بجھانا تھا ـــــ ابا راستے میں بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے اور لٹ پٹا کر ہم، اماں اور بھائی میاں کسی نہ کسی طرح بچ نکلے ـــــ ان دنوں میں کسقدر ذرا سی تھی ـــــ ؟ پھول کی طرح تازہ ـــــ کانچ کی طرح نازک۔ اماں مجھے اس طرح بچا بچا کر لائی تھیں جیسے مرغی، چیل کو منڈلاتے دیکھ کر اپنے پروں میں اپنے بچوں کو چھپا چھپا لیتی ہے ـــــ میں اماں کے پروں میں دبی دھنسی، پتہ نہیں کن کن راستوں سے گزرتی جاتی تھی ـــــ راستے میں کبھی کبھار آنکھیں کھول کر ذرا سا سر اُٹھا کر ریل کی کھڑکی سے باہر جھانکتی تو رات کا پُر اسرار اندھیرا اور سناٹا جیسے میری روح سلب کئے لیتا ـــــ میں گھبرا کر پھر آنکھیں موندھ لیتی۔

زندگی کا پہلا سفر انہی اندھیروں میں کٹا ـــــ شاید اس دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو اجالوں کی چاہ کرتے ہیں۔ انہی کو اندھیرے ملتے ہیں ـــــ اپنے پیچھے ہم کیسی زندگی چھوڑ آئے تھے ـــــ ؟؟ بھرا پُرا گھر ـــــ ہنستا جھومتا وہ باغ ـــــ پورٹیکو میں ابھی ابھی آکر کھڑی ہوئی کار ـــــ وہ نیلے رنگ کے پردوں والا ڈرائنگ روم ـــ اور ـــ اور

(تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ـــــ ؟؟)

ہم آگے بڑھ آئے، زندگی وہیں رہ گئی ـــــ میں نے اپنی کتابیں کاپیاں جو میز پر کھول کر رکھی تھیں، شاید ابھی تک کھلی پڑی ہوں ـــــ ! میز کے کنارے میں نے دوات کا ڈھکنا رکھ دیا تھا ـــ کون جانے وہ وہیں پڑا ہو ـــــ الجبرا کا ایک سوال میں نے ابھی پورا حل بھی نہیں کیا تھا ـــــ سنہری سُنہری روشنی میں اپنی میز پر جھکی جھکی میں کسقدر لگن اور اشتیاق سے ادھورا سوال حل کر رہی تھی ؟؟ پھر میں وہ سوال کبھی حل نہ کر سکی، وہ سنہری روشنی وہیں کھو گئی ـــــ شاید دوات لڑھک گئی تھی تبھی تو سارے میں سیاہی پھیل گئی تھی ـــــ رات کی طرح تاریک اور ڈراؤنی ـــــ پھر سب کچھ

اس سیاہی، اس تاریکی میں ڈوب گیا ـــــ مٹ گیا ـــــ فنا ہو گیا اور ہم دھیرے دھیرے چوروں کی طرح اپنے ہی گھر سے یوں نکل آئے کہ پیچھے پلٹ کر دیکھ بھی نہ سکے ـــــ میں تم سے پوچھتی ہوں اتنے دن گزرنے پر بھی یہ دکھ جی سے کیوں نہیں جاتا ـــــ ماہ و سال کے کندھوں پر رکھا ہوا یہ بوجھ ہلکا کیوں نہیں ہوتا ـــــ کیوں نہیں ہوتا ـــــ؟؟ بولو ـــــ بولو نا ـــــ مگر نہیں ـــــ مجھے اس طرح جذباتی نہیں ہونا چاہئے ـــــ مجھے آج تم سے کوئی سوال نہیں کرنا ہے ـــــ بس تمہیں سب کچھ سنانا ہے جی کا یہ بوجھ کسی طرح تو ہلکا پڑے ـــــ دل کا یہ دُکھڑا کوئی تو سُنے ـــــ میرے غم سے بھرے دل کو ایک ہلکی سی مسرّت یہ تو مل جائے کہ کوئی تو تھا جس نے میرا غم بانٹا ـــــ! تمہارا یہ پرسکون انداز، تمہاری یہ خاموشی بتا رہی ہے کہ واقعی تم غور سے میری باتیں سُن رہے ہو ـــــ نا؟؟

میں الجھے ہوئے دھاگوں میں سرا تلاش کرتے کرتے بھٹک جاتی ہوں ـــــ بھول جاتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی تھی ـــــ اتنی ساری باتیں اکدم سے زبان کی نوک پر آکر مچلنے لگیں تو کیسے نہ کوئی راہ بھولے؟ کیسے نہ میں سرا کھو دوں ـــــ؟

ہم نے اس دیارِ غیر میں قدم رکھا تو کوئی آسرا نہ تھا ـــــ کوئی سہارا نہ تھا ـــــ بھائی میاں اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرنا چاہتے تھے، مگر کوئی ذریعہ، کوئی آسرا نہ تھا ـــــ وہ ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھتے تھے مگر صرف ایف ایس سی پر آکر ان کی گاڑی رُک گئی ـــــ میں نے زندگی کے جو سہانے خواب بُنے تھے، سب جہاں کے تہاں رہ گئے ـــــ بھائی میاں جوتیاں چٹخاتے سارے شہر کی خاک چھانا کرتے کہ کہیں سے چار پیسے کا آسرا مل جائے اور ادھر میں اور اماں ایک تنگ تاریک سے مکان میں ...... (ایسا مکان، جسے مکان کہنے کو بھی جی نہیں چاہتا) زندگی کی دھوپ چھاؤں کے رنگ دیکھا کرتیں۔ کیا تم سمجھتے ہو ویرانے میں کھلنے والی کلی کبھی پھول نہیں بنتی ـــــ؟؟ میں اسی ویرانے میں کلی سے پھول بننے لگی ـــــ اور سچ جانو ایک دن اسی اندھیارے گھر کی دیواروں نے پہلی بار چاند کی کرنوں کا سامنا کیا !!

بھائی میاں کو چالیس روپیہ ماہانہ کی بہت بڑھیا سی ملازمت مل چکی تھی۔ جہاں وہ دن بھر مغز پاشی کرتے اور شام کو یوں لوٹتے جیسے ابھی ابھی مر جائیں گے ـــــ کاش مر ہی جاتے زمین کی چھاتی پر کا بوجھ کچھ تو کم ہوتا ـــــ! مگر یہ سنو کہ ہم میں سے کبھی کوئی نہ مرا ـــــ دنیا میں غریبوں کے لئے جینے کی تو کوئی راہ ہی نہیں، مگر مرنے کی بھی کوئی راہ نہیں ـــــ کوئی کیا جئے کوئی کیا مرے۔ معاف کرنا۔ تم پتہ نہیں ہمارے متعلق کیا سوچو، مگر یہ بات بغیر سُنائے میں نہیں رہوں گی کہ ان حالات کے باوجود میرا ایک اس قدر اعلیٰ گھرانے میں رشتہ طے پا جانا، کس وجہ سے تھا۔ وہ محض ایک سوٹ تھا ـــــ ہاں اونی سوٹ ـــــ گرے کلر کا ـــــ بھلے ہی تم اسے بُرا کہہ لو، مگر میں

نہیں کہوں گی ـــ اگر آدمی کو کھانے کو نہ ملے، پہننے کو نہ ملے تو میں سمجھتی ہوں اُسے ہر عیب کو ہُنر سمجھنا چاہیئے ـــ بھائی میاں کئی دنوں سے ایک جوڑے پر گزارہ کر رہے تھے ـــ چالیس روپیہ میں کیا ہو سکتا ہے۔؟ شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں نہ آ سکے۔ مگر ہم تو سمجھ سکتے ہیں نا ـــ اس دن چکنی کالی لمبی سڑک پر جبکہ کوئی موٹر، سائیکل، بس نہ تھی، اکیلے بھائی میاں چلتے چلتے آ رہے تھے اور ان کے آگے آگے ایک خوش پوش جوان ـــ (اوہ ذرا سوچو۔ غریبی کسقدر بڑی معلم ہے ـــ) بھائی میاں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے اور پیچھے سے اس خوش پوش کی گردن پر ایک دھول جمائی ـــ بھائی میاں ایسے کوئی ظالم تو نہ تھے کہ اسے جان سے مارنے کے بارے میں سوچتے ـــ وہ تو محض اپنی ضرورت پوری کرنا چاہتے تھے ـــ تھوڑی دیر بعد جب بھائی میاں اُسی تمکنت اور بھرم سے سڑک پر چل رہے تھے تو ان کے جسم پر وہ قیمتی گرے کلر کا سوٹ تھا اور اس خوش پوش نوجوان کے جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔

ہاں تب میں نے جانا کہ لباس قسمتیں بدل دیا کرتا ہے ـــ بدل سکتا ہے ـــ دیکھو ہم لوگ غریب ضرور ہیں، مگر اپنا عیب نہیں چھپاتے ـــ سچائی میں جیت ہے نا ـــ بس اسی لئے ـــ رات کو بھائی میاں نے بڑے فخر سے بتایا کہ کس طرح وہ پلک جھپکتے میں ایک قیمتی سوٹ کے مالک بن بیٹھے تھے۔ اس رات ہم دونوں کتنی دیر تک ہنستے رہے تھے ـــ! اُف پوچھو مت ـــ کیسی خوشی تھی کہ بس ہنسی رکتی نہ تھی ـــ!

دوسرے دن وہی سوٹ پہن کر بھائی میاں اپنی سروس پر گئے تھے ـــ اور پھر پتہ ہے کیا ہوا ؟؟ اسے اتفاق بھی کہہ سکتے ہیں ـــ قسمت بھی کہہ سکتے ہیں ـــ بہرحال ہوا یوں کہ جب بھائی میاں اپنی میز پر جھکے قلم چلا رہے تھے تو ان کا باس ان کے پاس آکھڑا ہوا ـــ پہلے وہ تو سر سے پاؤں تک ان کو دیکھتا رہا دیکھتا رہا پھر یوں گھوم پھر کر ان کے گرد پھیرے ڈالے جیسے کوئی قربانی کے لئے بکرا خریدنا چاہتا ہو ـــ دیکھ لینا چاہتا ہو کہ کوئی کمی تو نہیں ہے، لنگڑا تو نہیں، لنگڑا تو نہیں ہے، بیمار تو نہیں ہے ـــ بھائی میاں نے سر اُٹھا کر دیکھا اور گھبرا کر سر جھکا لیا۔

"آجکل تو یہ کپڑا ملتا ہی نہیں ـــ کہاں سے خریدا مسٹر ـــ" وہ بہت سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی ـــ جی ـــ جی ـــ" بھائی میاں ہکلا گئے اور بولے" اگر آپ کو یوں ہی بھلا لگتا ہے تو لے لیجئے نا ـــ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی میری ـــ"، باس مُسکرا کر رہ گیا ـــ

گھر آکر پوری روداد بھائی میاں نے مجھے بتائی اور یہ بھی کہا کہ اس اہم فرض کو میں ہی انجام دوں۔ کہ ان کے باس تک یہ سوٹ پہنچا دوں۔ (اس لمحہ اُن کے چہرے پر چراغ سا جل رہا تھا ـــ امید کا ہی ہو گا ـــ!)

پہلے تو بڑی دیر تک حیل حجت ہوتی رہی کہ میرا جانا مناسب ہوگا بھی یا نہیں ـــــ اور جب یہ طے ہوگیا تو یہ مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ میں اتنے بڑے بنگلے پر جاؤں گی تو سہی مگر پہنوں گی کیا ـــــ ؟

تم یوں لمبے لمبے سانس کیوں لے رہے ہو ـــــ ؟ ترل ـــــ ترل ـــــ ترل ـــــ شاید سوچ رہے ہو کہ آگے میں کیا کہوں گی ـــــ ہاں شاید تم یقین نہ کرو کہ زندگی کیا تھی ـــــ کیسی تھی کس کم بخت کے پاس خوشی تھی ـــــ ؟؟ آنسو ہی تو تھے جو ہر موقع پر برس برس کر اندھیروں میں اجالے پیدا کرتے تھے ـــــ خیر ـــــ اس اکلوتی سفید ساڑھی کو جو اماں نے پتہ نہیں کس خیال سے سینت کر رکھی تھی، میں نے اپنے جسم کے گرد لپیٹا ـــــ ! اور تم ایک لمحے کو تو سوچو کہ اس سفید لباس میں میں کیا قیامت ڈھا رہی ہوں گی ـــــ ؟؟ یہ گال اس وقت مرجھا کر زرد پڑ گئے ہیں تو کیا ہوا ـــــ ؟ یہ لمبے لمبے بال اب دھول سے اَٹ گئے ہیں تو کیا ہوا ـــــ تب تو میں ایسی نہ تھی ـــــ میں تو شبنم میں نہایا ہوا تازہ تازہ پھول تھی، جس کی پنکھڑی پنکھڑی سے رس نتھرتا تھا۔

حسن اپنی قیمت ـــــ اپنی بولی اُٹھوانے چلا تھا ـــــ !

بھائی میاں نے پھاٹک کو ذرا سا دھکا دیا اور ایک بڑے بڑے بالوں والے پیلے رنگ کے کتے نے بھونک بھونک کر ہمارا استقبال کیا ـــــ بھائی میاں تو مصلحتاً باہر جا کر چھپ گئے اور میں وہیں کاغذ میں تہہ شدہ سوٹ سنبھالے سہمی سی کھڑی رہ گئی ـــــ کتے کی آواز سن کر پہلے تو چپراسی اور پھر ایک خوبصورت سا جوان آدمی باہر نکل آیا۔

اب میں تم سے یہ نہ بتاؤں گی کہ کتنے لمحے یوں ہی گزر گئے تھے ـــــ نہیں۔ ایک بھی لمحہ نہیں گزرا تھا ـــــ نہیں نہیں ـــــ شاید میں بھول گئی ہوں ـــــ مجھے تو کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ ساری عمر گزر گئی تھی ـــــ ایک صدی سے کم کیا گزری ہوگی ـــــ نہیں شاید وقت ٹھٹھک کر یوں ہی ساکت ہو گیا تھا ـــــ وقت تو مگر کبھی نہیں رکتا نا ـــــ ؟ تو شاید میں ہی بھول رہی ہوں ـــــ !

پھر میں ایک بہت سجے سجائے ڈرائنگ روم میں تھی ـــــ ہمارے دِلّی والے ڈرائنگ روم سے بھی بڑھ چڑھ کر سجا سجایا ـــــ ! تم کیا سمجھتے ہو میں اپنا ماضی بھول گئی ہوں ـــــ بھول سکتی ہوں ـــــ ؟ ارے توبہ کرو ـــــ عورت کے چار آنکھیں ہوتی ہیں ـــــ دو چہرے پر ـــــ دو پیٹھ پہ چہرے پر کی آنکھیں تو سبھوں کو نظر آتی ہیں، مگر وہ جو پیٹھ پہ ہوتی ہیں نا وہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ صرف عورت انھیں محسوس کرتی اور ان سے ماضی کو دیکھتی رہتی ہے ـــــ پوجتی رہتی ہے ـــــ مرد کی نگاہ مستقبل پہ ہوتی ہے اور عورت ماضی کو دیکھتی، پلٹ پلٹ کر، مڑ مڑ کر، بڑھتی ہے ـــــ میں کیسے اپنا ماضی بھول جاؤں ـــــ بچہ تھی تو کیا ہوا۔ عورت تو تھی ـــــ !

میں سہمے ہوئے پرندے کی طرح صوفے کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی اور وہ بچوں کی طرح مجھ

سے برتاؤ کر رہے تھے ـــــ یہ لو ـــــ وہ لو ـــــ یہ کھاؤ ـــــ وہ چکھو"

اتنے میں دروازے کا پردہ ہٹا اور بھائی میاں داخل ہوئے ـــــ اپنے ازلی اور اکلوتے جوڑے میں ملبوس ـــــ میں نے ذرا طنز سے باس کی طرف دیکھا ـــــ "دیکھ لی ہماری حقیقت" میری نگاہیں یہی کچھ کہہ رہی ہوں گی اُس کا مجھے یقین ہے ـــــ کیونکہ اُسی لمحہ میری نگاہوں کو پڑھ کر انھوں نے فوراً بھائی میاں سے کہا تھا۔ ـــــ

"جمیل صاحب ـــــ بات بے ڈھب اور اچانک ہی کہہ رہا ہوں ـــــ مگر کیا آپ اپنی بہن کو میری دُلہن بنانا پسند کریں گے ـــــ ؟"

وہ باس تھے اور بھائی میاں ان کے ماتحت ـــــ شاید کوئی اور موقعہ ہوتا، کوئی دوسرا مخاطب ہوتا، تو ان کے لہجے میں اتنی بے تکلفی اور انداز گفتگو اتنا صاف صاف نہ ہوتا ـــــ مگر بھائی میاں تو پاتال میں تھے۔

بھائی میاں اس قدر سراسیمہ اس قدر حیرت زدہ، اس قدر پریشان سے رہ گئے کہ منہ سے کچھ نکلا ہی نہیں ـــــ ! بڑی دیر بعد وہ بولنے پر آئے تو پھر بولتے ہی چلے گئے اور ہماری زندگی کی کوئی بات ایسی نہ تھی، جو انھوں نے نہ سنادی ہو ـــــ !

"میں جانتا ہوں ـــــ میں جانتا ہوں ـــــ" وہ سگار کو میز پر تھپک تھپک کر اتنا ہی کہے جا رہے تھے ـــــ

"آپ جانتے ہیں نا ہم کتنے غریب ہیں ـــــ آپ کو معلوم ہوگا نا کہ میری بہن صرف ساتویں کلاس پاس ہے ـــــ آپ تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہمارے پاس رہنے کو ڈھنگ کا مکان بھی نہیں۔ پہننے کو کپڑے بھی نہیں ـــــ سونے کو بستر بھی نہیں ـــــ اور......"

"اور انھوں نے بات کاٹ دی ـــــ" اور آپ جانتے ہیں کہ میں ایک نواب باپ کا بیٹا ہوں ـــــ اپنا ایک ذاتی بزنس چلاتے ہوں، اتنی بڑی دولت کا مالک ہوں ـــــ اتنے بڑے بنگلے میں تنہا رہتا اور تنہا حقدار ہوں ـــــ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں محض سیر کے طور پر ہزاروں روپے خرچ کر کے لندن ہو آیا ہوں ـــــ اور آپ اب یہ بھی جان رہے ہیں کہ میں آپ سے آپ کی بہن کا ہاتھ مانگ رہا ہوں ـــــ اور یہ بھی سُن لیں میں پاگل نہیں ہوں ـــــ آپ سے مذاق بھی نہیں کر رہا ہوں ـــــ آپ کو دھوکا بھی نہیں دے رہا ہوں ـــــ آپ کی بہن سے باقاعدہ شادی کروں گا" وہ رُکے ـــــ آگے بڑھے ـــــ میرے قریب آکر ٹھٹھک گئے اور میرا چہرہ اوپر اُٹھا کر بولے۔

"یہ انسان نہیں ـــــ پری ہے ـــــ اور میں بہت حُسن پرست واقع ہوا ہوں جمیل۔"

اور وہ امید بھری نگاہوں سے بھائی میاں کو دیکھنے لگے۔

تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ـــــ ؟؟

ایک انسان، خدا بن کر ہماری زندگی میں آیا اور ہم پر آسمان بنکر چھا گیا !

زندگی کسقدر حسین تھی ـــــ ! کتنی خوشگوار ـــــ کتنی پیاری ـــــ مگر ـــــ مگر کیا انجام بھی اتنا ہی حسین، اتنا ہی خوشگوار، اتنا ہی پیارا ہو سکتا تھا ـــــ ؟

تم بے چین ہو رہے ہو ـــــ ہاں تمہاری ساکن سطح پر یہ کیسی ہلچل ہے ـــــ کیا میری باتوں سے تمہارے دل میں دُکھ کی لہریں پیدا ہو رہی ہیں ؟؟

اے رودِ موسیٰ ـــــ ٹھہر جا ـــــ تھم جا ـــــ میری باتیں سُن لے ـــــ میرے دل کا درد، اپنے دل میں بھر لے ـــــ میں اس درد کو اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی ـــــ نہیں لے جانا چاہتی ـــــ آج اپنی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں کا حساب لے کر میں تیرے پاس آئی ہوں سُن لے میری داستاں ـــــ سُن لے ـــــ سُن لے

زندگی پر چھائے غم کے گہرے بادل جیسے ایکدم چھٹ کر رہ گئے ـــــ زندگی میں سکون اور مسرت آگئی ـــــ یہ ایسی خوشی تھی جس کے بارے میں سوچا بھی نہ جا سکتا تھا ـــــ دماں میرے لئے کتنی پریشان رہا کرتی تھیں ـــــ غریبی اور حُسن جہاں ایک جگہ ہو جائیں وہاں آپ ہی آپ چکلہ کھل جاتا ہے۔ جوانی بہاریں لٹاتی آتی ہے اور پھر کسی سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ـــــ اب نافۂ مشک کی طرح میری خوشبو گھر سے باہر نکل کر پھیل رہی تھی ـــــ زندگی جس راہ پر جا رہی تھی، اُسے دیکھتے ہوئے اس کے سوا اور سوچا بھی کیا جا سکتا تھا ـــــ ؟ مگر بالکل اس طرح، جیسے کالی رات میں اچانک بجلی چمک جائے ـــــ اسی انداز سے ضیا میری زندگی میں داخل ہو گیا۔

بھائی میاں مجھے سر پر دھول دھپے جڑ جڑ کر چھری کانٹے سے کھانا کھانا سکھانے لگے اور اماں مجھے رہ رہ کر گھورنے لگیں کہ میں یہ رشتہ کھو نہ بیٹھوں ـــــ !!

اے موسیٰ کے گہرے پانیو ـــــ اے بے تاب لہرو ـــــ ذرا میرے دل میں آکر جھانکو۔ اے موسیٰ تیری زندگی تو اسی حیدر آباد میں گزری ہے، یہاں کے چپّے چپّے سے تیری شناسائی ہوگی۔ یہاں کی زندگی کا ہر ہر راز تیرے سینے میں دفن ہوگا ـــــ مجھے یہ تو بتا کیا یہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ، بیٹیوں کے دلوں کا خون کر دیں ـــــ ! دولت کے بل پر اپنی بوڑھی رگوں کے لئے تازہ خون خرید لیں ـــــ کیا یہاں پیسہ ہی سب کچھ ہے ـــــ کیا نیکی، سچائی اور پیار کا کوئی مول نہیں ـــــ کوئی قیمت نہیں ـــــ ؟؟ میں ان اتھل پتھل لہروں سے جواب مانگتی ہوں ـــــ بولو ـــــ بولو ـــــ مگر نہیں ـــــ مجھے آج کوئی سوال کرنا نہیں ہے ـــــ مجھے تو آج صرف اپنی داستان سنانی ہے ـــــ یہ دُکھ، یہ کرب یہ غم میں اپنے سینے میں نہیں لے جانا چاہتی ہوں ـــــ

میں پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہو جانا چاہتی ہوں ——

اس دن میں اور بھائی میاں ضیاء صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے —— وہ خود کہیں باہر گئے ہوئے تھے —— بارش زور شور سے ہو رہی تھی اور میں نے سردی سے بچنے کو اپنی ساڑی کا آنچل اپنے کانوں اور سر کے گرد لپیٹ لیا تھا —— بیٹھے بیٹھے بھائی میاں نے مجھے دیکھا اور یوں ہی ہنس کر کہا —— "مہر —— خدا کی قسم تو خطرناک حد تک حسین ہے —— کوئی حیرت کی بات نہیں جو......

......ضیا صاحب نے تجھے مانگ لیا —— مجھے تو فرشتوں کے بارے میں بھی شک کرنا پڑے گا ——!"

میں نے ذرا جھینپ کر سر جھکا لیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے پھر سے سر اُٹھانا پڑا —— کیونکہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور ....

ہم دونوں گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے —— وہ ضیا صاحب نہیں تھے، کوئی اور تھا —— آنے والے کی نگاہیں جیسے مجھ پر جم کر رہ گئیں تھیں —— اور خود میں بھی گھبرا کر بھائی میاں کو دیکھتی تھی، کبھی آنے والے کو ——

"آپ کی تعریف ——؟" آخر آنے والے نے بھائی میاں سے مخاطب ہو کر زبان کھولی

"جی میں جمیل ہوں —— ضیا صاحب میرے بوس ہیں —— اور یہ —— یہ میری بہن ... مہر"

"بیج بیج مہر ——" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور پھر بولا —— "اور میں ضیا کا والد ہوں، نواب آصف الدولہ —— نام تو سُنا ہو گا میرا ——؟" وہ مسکرا کر میری طرف گھوما —— "حیدرآباد میں جتنی کوٹھیاں میری ہیں، اتنی شاید ہی کسی نے بنوائی ہوں —— اور پھر کوٹھیوں کی کیا بات ہے۔ بزنس وغیرہ بھی چلتے ہی رہتے ہیں —— اور ضیا میاں کو جو کام میں نے سونپا ہے وہ بھی بس .... وہ خود ہی مسکرا کر رُک گیا —— مگر ہم دونوں میں سے کوئی نہ مسکرایا —— پہلی ہی ملاقات میں، آتے ہی ایسی بے سر پیر کا ہانکنا —— کچھ عجیب سا لگ رہا تھا —— یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہو بھی سکتا ہے —— یقین نہیں آتا تھا کہ اتنے عجیب انداز میں تو کوئی اپنے متعلق نہیں بتاتا —— اور حد یہ کہ کسی نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا تھا —— وہ پھر کہے گیا ——

"جب کبھی اپنے بیٹے سے ملنے آتا ہوں تو بس یوں ہی اُٹ جھپٹ کر چلا جاتا ہوں —— نوکروں اور مصاحبوں کے جھگڑے میں باہر نکلنا مجھے مطلق پسند نہیں —— کار بھی خود ہی ڈرائیو کرتا آیا ہوں —— پورے ساٹھ ہزار کی ہے ——"

یقیناً یہ شخص پاگل ہے —— میں نے دل ہی دل میں سوچا —— مگر اُسے دیکھ کر میں اسقدر سہم گئی تھی کہ کچھ نہ کہہ سکی ——!

تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ——؟ ذرا دل لگا کر سنو خدا کی بنائی یہ دنیا کیسی ہے۔

یہاں بسنے والے کیسے ہیں ____ تو تم جاننا چاہو گے نا کہ پھر آخر ہوا کیا ____! تو سنو اس بڈھے نے مجھے بھائی میاں سے مانگ لیا ____!

ترل ____ ترل ____ ترل ____ یہ تمہارے سینے میں بے چینی کیسی؟ شاید تمہیں حیرت ہو رہی ہے ____ مگر اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میرے شفیق اور مہربان دوست یہ دنیا ہے، یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے ____ اور جب بھائی میاں نے انکار کیا تو وہ سانپ پھنپنا اٹھا۔ اس کے حرم میں شاید مجھ ایسی بے بس روح کی ہی کمی تھی جو وہ مجھ پر ہر حربہ آزمانے تل گیا ____ اور پھر انسان نے انسان کے ساتھ، شیطان کی سی چال چلی ____

روپیہ ____ روپیہ ____ روپیہ ____ اس دنیا میں روپیہ کیا نہیں کر سکتا ____؟؟ کیا نہیں کر سکتا ____ محبت کی بولی لگوا سکتا ہے ____ پیار کا نیلام کروا سکتا ہے۔ بہن کی محبت کو بکوا سکتا ہے ____ تم جانو دس ہزار روپے معمولی چیز تو ہوتے نہیں ____ بھائی میاں نے مجھے بہکانا شروع کیا۔

"مہرو ____ تو یہ سوچ زندگی بھر روپوں پر چلے گی ____ ضیا جو اتنا امیر ہے تو نواب صاحب کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا ____ نواب صاحب آسمان ہیں وہ پاتال ہے ____ تو تو ملکہ بن کر راج رچے گی ہاں دیکھ انکار نہ کرنا ____"

میں کبھی غصہ کو چھپا کر ان کی طرف دیکھتی تو وہ میری سرخ رنگت کو شرم پہ محمول کرتے۔ کیسی بے بسی تھی ____؟ ذرا سوچنا ____

بس یہاں بھائی میاں کو بھی الزام نہیں دوں گی ____ کیوں دوں؟ زندگی سے خوشیاں سمیٹنے کا حق ہر انسان کو ملنا چاہئے ____ نہیں ملتا تو پھر وہ ٹیڑھے میڑھے راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے بھائی میاں نے اب تک کیسی زندگی گزاری تھی ____؟ ضیا نے صرف مجھے مانگا تھا ____ میرے دکھوں کو سمیٹ کر اپنے دل میں چھپانا چاہتا تھا ____ بھائی میاں کے سکھوں کے لئے اس نے کیا قیمت ادا کی۔ یہ کچھ بھی تو نہیں ____ اگر یہاں انھیں کوئی فائدہ نظر آیا تو کیا برا کیا جو انھوں نے میری زندگی کی بولی اٹھا دی ____!

____؟؟ یہ دنیا ہے میرے بوڑھے دوست ____ یہاں ایسا ہی ہونا چاہئے ____!

بھائی میاں کے جسم پر اب بہترین کپڑے تھے، رہنے کو خوبصورت سا گھر ____ اور زندگی کی ہر آسائش مہیا تھی ____ ایک دن نواب صاحب نے ہمیں خاص الخاص اپنے دولت کدے پر بلوایا تھا ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر جب ہم آگے بڑھے تو ایک لمحے کو میں چکرا گئی ____ کیا اس قید خانے (وہ خوبصورت ہی سہی) میں مجھے رہنا ہوگا ____؟؟ میں نے گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا ____ میرے خدا ____ یہاں لوگ کیسے رہ سکتے ہوں گے ____؟ اتنی اونچی اور

ہیبت ناک دیواریں! کس میں بوتا تھا کہ ان کو پھلانگنے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ــــــ

نرم اور گہرے صوفے میں ایک بیگم بیٹھی ہوئی تھیں ــــــ بڑی رعونت سے دیکھتی ہوئی۔

بھائی میاں نے بڑھکر تعارف کروایا۔

"ان سے ملو مہر ــــــ یہ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں ــــــ اور یہ میری بہن ہے مہر"

میرا خون جوش کھا گیا ــــــ یہ میرا سگا بھائی تھا ــــــ میرا ماں جایا۔ جو نواب صاحب کی بیگم سے میرا تعارف کروا رہا تھا ــــــ میں نے پھوں پھوں کرکے اس کی طرف دیکھا ــــــ مجھے اس کی جیب سے نوٹ جھانکتے نظر آئے میں نے خود کو مطمئن کر لیا ــــــ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے ــــــ ایسا ہی ہونا چاہئے ــــــ اس کے آگے انسان اور سوچ بھی کیا ہے ــــــ؟؟

(تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ــــــ؟)

پتہ نہیں کن کن موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ــــــ پھر پردہ اُٹھا اور ایک بانکی طرحدار لڑکی کمرے میں داخل ہوئی ــــــ پتہ چلا وہ نواب صاحب کی بیٹی تھی، (جو عمر میں مجھ سے بھی بڑی تھی) اس نے لڑکوں کی طرح پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ سر کے بال پوڈل کٹ (POODIL CAT) کی شکل میں تھے ــــــ وہ مزے میں سگریٹ پھونکے جا رہی تھی اور دھوئیں کے مارے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ یوں تو ہم عورتوں کی زندگی دھوئیں میں ہی گزرتی ہے مگر تم جانو یہ دھواں تو دم گھونٹ دینے کو تلا ہوا تھا ــــــ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور وہ لڑکی اُچھلی ــــــ اپنے ہونٹوں کا سگریٹ نکال کر اس نے جھٹ اپنی ماں کے مُنہ میں دے دیا ــــــ

"ممّا ــــــ تم ذرا اسے اسموک کرو ــــــ میں ابھی آتا ہوں ــــــ"، ممّا خوشی خوشی سے اسموک کرنے لگیں ــــــ!

میں نے لرز کر دیکھا ــــــ یہ کیسی تہذیب تھی؟ یہ کیسی زندگی تھی ــــــ؟ کیا میں اس ماحول میں جی سکتی تھی ــــــ؟؟ میرا سانس رُک رُک کر چلنے لگا ــــــ بھائی میاں لہک لہک کر، ہنس ہنس کر سبھوں سے باتیں کئے جا رہے تھے ــــــ میں وہاں تھی مگر نہیں تھی ــــــ مجھے ہوش آیا تو وہ لڑکا نما لڑکی کہہ رہی تھی ــــــ"ہلو پپّا ایسا اسٹیچو ہم لوگاں میوزیم میں دیکھے تھے نا ــــــ؟" اس کا اشارہ میری طرف تھا ــــــ!

بھائی میاں نے اپنی بہن کے حُسن کی تعریف کو بڑی خوش دلی اور فخر سے سُنا اور سینہ تان کر مجھے دیکھنے لگے ــــــ "جیسے اس مال کا حقدار تو میں ہی ہوں ــــــ"۔

جب ہم باہر نکلے تو میرے قدم اس قدر وزنی ہو رہے تھے کہ مجھ سے چلتے نہ بن رہا تھا ــــــ دل و دماغ میں اس قدر کشمکش ہو رہی تھی ــــــ کیا کروں کیا نہ کروں ــــــ؟ اکدم مجھے نواب صاحب کے

مگر وہ چہرے اور بڑے بڑے دانتوں کا خیال آگیا اور میں نے طے کر لیا کہ نہیں میں اپنے آپ کو کبھی نہیں بیچوں گی ـــــ کبھی نہیں ـــــ کبھی نہیں ـــــ اس سے موت کیا بُری ہے ـــــ؟

میں نے بڑی ہمت کر کے، شرماتے شرماتے آہستگی سے بھائی میاں سے پوچھا ـ

"نواب صاحب کو معلوم نہیں کہ میری شادی ضیا صاحب سے ہونے والی ہے ـــــ؟"

"معلوم کیسے نہیں ہے ـــــ میں نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا مگر ـــــ وہ بات ادھوری چھوڑ یونہی رُک گئے ـ

میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر اسی لمحہ مجھے کوٹ کی جیب سے نوٹ جھانکتے نظر آ گئے ـــــ میں نے سوچا ـــــ ٹھیک ہی تو ہے ـــــ ٹھیک ہی تو ہے ـ اس کے آگے انسان کچھ نہیں سوچ سکتا ـــــ عقل چٹ ہو جاتی ہے ـ

(تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ـــــ؟؟)

گھر پہنچ کر بھائی میاں نے اماں سے میرے پیام کے بارے میں بات کی، اماں بھی راضی جیسی تھیں ـــــ "بیٹیاں تو اپنے گھر میں پھلتی پھولتی ہی بھلی لگتی ہیں اور ایسی بیٹیاں تو کبھی کبھار ہی جنم لیتی ہیں جو ماں باپ کا گھر بھی بھرتی جائیں ـــــ ورنہ بیٹیاں تو سدا گھر ہی خالی کرتی گئیں ہیں۔"

اماں کسی کام سے اُٹھ کر گئیں تو میں نے اپنی ساری ہمت سمیٹی اور منہ سے آواز نکالی ـــــ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ وہ بات نہ تھی جو میں کہنے چلی تھی ـــــ میں کچھ بھی بک گئی ـــــ پھر سے میں نے ہمت جمع کی اور سوچا ـــــ یہ تو میری زندگی اور موت کا سوال ہے ـــــ خاموشی سے کچھ نہیں بنے گا ـــــ مجھے کہہ دینا ہی چاہئے ـــــ اور میں نے پھر سے خود کو راضی کیا ـــــ

"بھائی میاں ـــــ" میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی ـــــ ان سے نظر ملانے کی ہمت مجھ میں نہ تھی ـ میں نے پھر تھوک نگلا اور بولی ـــــ "بھائی میاں ـــــ"

پھر کچھ اس طرح جیسے لبلبی دبا دینے پر پھٹ سے گولی نکل پڑے، میں بول گئی ـــــ "میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی ـــــ"

ـــــ میرے دل پر سے جیسے پہاڑ ہٹ گیا ـــــ بھائی میاں خلاف توقع یوں ہی بیٹھے رہے ـــــ شاید وہ مجھے سُوجھ بوجھ کی مہلت دے رہے تھے ـــــ بڑی دیر بعد بولے

"مہر تم ابھی بچی ہو ـــــ"

میں نے تیزی سے کہا ـــــ "بچی ہوتی تو یوں میرا سودا نہ ہوتا ـــــ"

اب کہ انھوں نے چونک کر دیکھا اور خود بھی تیزی سے بولے ـــــ

"بہت سمجھدار ہو گئی ہو ـــــ!!"

جب بڑے ناسمجھ ہو جائیں تو چھوٹے خود بخود سمجھدار ہو جاتے ہیں" ـــــ میں نے جل کر کہا ـــــ

"بک بک مت کرو ـــــ" وہ گرجے

میں نے ان کی طرف دیکھا

"بک بک تو آپ کر رہے ہیں ـــــ میں تو ہمیشہ سے ہی خاموش طبیعت ہوں ـــــ"

وہ تیزی سے اُٹھے، مگر جانے کیا سوچ کر رک گئے ـــــ بولے

"خیر آج نہیں کل تو جانے والی ٹھہری، اس لئے خاموش ہو جاتا ہوں، ورنہ ابھی اس بک بک کا مطلب سمجھا دیتا ـــــ"

میں نے اسی لہجے میں مضبوطی سے کہا ـــــ میں نے کہہ دیا میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی ـــــ اس سے اچھا تو یہ ہے کہ انسان شیر کے ساتھ اس کے بھٹ میں جا رہے ـــــ"

بھائی میاں میرے قریب آئے اور خونخوار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے ـــــ

"نہیں کرے گی نواب صاحب سے شادی ـــــ ؟ اور جو تیرے باپ کا گھر بھر دیا ہے نواب صاحب نے ـــــ ؟ یہ عیش و آسائش اور کہاں سے مل سکتی ہے ناسمجھ کتیا ـــــ بھول گئی کیا دو دو دن کے فاقے کرتی تھی، اندھیرے میں سوتی تھی، ننگی پھرتی تھی ـــــ اب رہنے کو گھر مل گیا ہے ـــــ پہننے کو ریشم مل گیا اور پیٹ میں تر مال پہنچ گیا تو اینٹھتی ہے حرام زادی ـــــ

تم سُن رہے ہو نا ـــــ ؟ یہ میرا بھائی تھا ـــــ سگا بھائی، جو مجھ سے یہ سب کچھ کہہ رہا تھا ـــــ میں نے جلبلا کر کہا ـــــ

"مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے ـــــ مجھے اپنی وہی زندگی پسند ہے ـــــ"

"ہے نافیقری ـــــ اپنی اصلیت پر ہی جانے والی ـــــ مگر اب میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔"

میں اسی تیزی سے نہیں نہیں کہے گئی اور بھائی میاں نے پیرے جوتا نکال لیا ـــــ ان کا دم اُلٹ گیا۔ میرا جسم نیلا پڑ گیا ـــــ اور میں بے سُدھ ہو کر فرش پر گر پڑی ـــــ

"دیکھتا ہوں کیسے نہیں کرتی ـــــ" جاتے جاتے وہ پھر غُرّا گئے ـــــ

پھر دھیرے دھیرے رات گزرنے لگی ـــــ میرے نصیبوں کی طرح سیاہ رات آنسوؤں کے ستارے لئے دبے پاؤں، میرے قریب سے گزرنے لگی ـــــ جوتوں سے میرا جسم درد کر رہا تھا زخم رس رہے تھے اور چکر کے مارے سر نہ اُٹھتا تھا ـــــ

"بھاگ چل ـــــ خدا کی اتنی بڑی دنیا میں تیرا کوئی تو ٹھکانا ہو گا۔ یہی وقت ہے ـــــ دیر نہ کر۔"

میں نے یہ پکار سُنی اور سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا ـــــ زیرو پاور کا بلب بڑی اداس روشنی بکھیر رہا تھا ـــــ اماں کا کمرہ پرلے سرے پر تھا، بھائی میاں کے کمرے سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی اور... اور

میں نے دھیرے دھیرے خود کو سہارا دیا ــــــ اور کسی صورت کھڑی ہو گئی ــــــ جسم ٹوٹا جا رہا تھا۔ آنسو بہے جا رہے تھے اور سارا عالم ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا ــــــ پھر میں نے دھیرے دھیرے اپنے جسم کو پیروں کے سہارے آگے بڑھانا شروع کیا ــــــ الوداع میری پیاری ماں ــــــ الوداع... میں نے کمرے کی طرف دیکھا جہاں میری ماں سوئی ہوئی تھی۔ اپنے دل میں کئی اُدھوری حسرتیں لئے ــــــ بیٹے کے بیاہ کی ــــــ بیٹی کی وداعی کی، پوتے کھلانے کی، نواسے جھلانے کی ــــــ آج یہ سب حسرتیں ہمیشگی کی نیند سو رہی ہیں ــــــ میری ماں الوداع ــــــ الوداع ــــــ

بھائی میاں کے کمرے کی طرف منہ کر کے میں کتنی ہی دیر یوں ہی کھڑی رہی ــــــ اے مالک تو نے عورت کے سینے میں اتنا درد کیوں بھر دیا ــــــ؟ جو اسے دُکھ دیتا ہے، اُسے ہی پیار کرتی ہے۔ جو اُسے سے نفرت ــــــ کرتا ہے اُسی سے محبت کرتی ہے ــــــ تو نے عورت کا دل، بہن کا دل اتنا درد مند کیوں بنایا ــــــ؟ الوداع میرے بھیا ــــــ الوداع ــــــ زخموں کے نشان جب تک میرے جسم پر رہیں گے، پھول بن بن کر مہکیں گے اور تمہاری یاد دلائیں گے ــــــ آج تمہارا پیار دولت کے انبار تلے دب گیا ہے مگر کبھی تو تمہیں اس دل کی یاد آئے گی جس کی ایک ایک ادا پر تم دل سے ہنستے تھے، خوش ہوتے تھے پیار کرتے تھے ــــــ مسکراتے تھے ــــــ الوداع ــــــ

دروازے سے سر لگا کر میں کتنی ہی دیر کھڑی رہی ــــــ رات آہستہ آہستہ یوں جا رہی تھی جیسے کوئی دلہن میکے سے پہلی بار سسرال کو چلے ــــــ! قدموں میں وہی بوجھل پن ــــــ دل میں وہی غم ــــــ آنکھوں میں وہی ستارے ــــــ آج دو دلہنیں اپنے اپنے میکوں سے لوٹ رہی تھیں ــــــ اے رات تیرا پیا تو افق کے اس پار تیرا منتظر ہے ــــــ تیرا پیا تو سورج کا تلک لئے تیری راہ تک رہا ہے ــــــ دیکھتے ہی دیکھتے تو محبت کی دہلیز پر قدم دھر دے گی اور تیری زندگی میں صبح کا نور بھر جائے گا ــــــ مگر میں؟ میں کون سے پیا کی منتظر ہوں ــــــ؟؟ میری پیشانی پر کون سے سورج کا ٹیکہ جھلکے گا ــــــ؟؟ میں کون دیش کو جا رہی ہوں ــــــ؟ غم کی ڈوبتی پرچھائیوں کے ساتھ میرے دل میں پیار کی روشنی، امیدوں کی کرنیں اور محبت کے پھول کیوں نہیں مہک رہے ہیں ــــــ؟ میں کہاں جا رہی ہوں ــــــ کہاں ــــــ؟؟؟

میں نے ایک بار پیچھے پلٹ کر دیکھا اور پھر آگے بڑھتی چلی گئی ــــــ تو سنا تم نے؟ میں گھر سے نکل گئی ــــــ اور آج مجھے گھر سے نکلے پانچواں دن ہے ــــــ پانچواں ــــــ اور ان پانچ دنوں میں زندگی سے جی بھر گیا ہے ــــــ ان پانچ دنوں کی کہانی بھی تمہیں سُنا دوں پھر میرا دل ہلکا ہو جائے گا ــــــ پھر مجھے یہ غم نہیں رہے گا کہ دنیا میں کسی نے میری داستانِ غم نہ سُنی کہ ایک لمحے کو ہی سہی، جی ہلکا تو ہو جاتا ــــــ! تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ــــــ؟

میں گھر سے نکل تو گئی مگر معلوم نہ تھا کہ کہاں جاؤں گی ـــــ کدھر جاؤں گی ـــــ ایک جوان اور خوبصورت عورت کے لئے دنیا میں جگہ ہو بھی کہاں سکتی ہے ـــــ ؟ میں صبح تک چلتی رہی ـــــ جب سورج نے ہر طرف روشنی بکھیرنی شروع کی، میں ایک نل کے پاس کھڑی تھی ـــــ میں نے چلوؤں میں پانی لے کر اپنا چہرہ دھویا اور جب گرد آلود بال جھٹکانے لگی تو نل کے پاس کھڑی عورتیں مجھ سے پوچھنے لگیں ـــــ

"کیا تم عورت ہو ـــــ ؟"

میں ہنسنے لگی ـــــ عورت ہوں اسی لئے تو یہ دکھ اٹھانے پڑ رہے ہیں ـــــ میں نے دل میں سوچا ـــــ

میری ہنسی پر وہ اور حیرت زدہ ہوئیں اور آپس میں بولنے لگیں ـــــ "صبح صبح آوارہ روحیں بھٹکا کرتی ہیں ـــــ یہ تو کوئی ہم تم جیسی عورت نہیں معلوم پڑتی جی ـــــ اور وہ اپنے اپنے مٹکے گھڑے اٹھائے گھروں کو بھاگنے لگیں ـــــ مجھے پھر ہنسی آگئی ـــــ آج سارا زمانہ مجھ سے دور بھاگ رہا ہے، میرے دل نے درد کے ساتھ سوچا ـــــ میں نے آواز دی ـــــ "میں روح نہیں ہوں، ایک دکھیا عورت ہوں ـــــ میری بات تو سن لو، میرے دل کا درد تو دیکھ لو ـــــ" مگر وہ پیچھے نہ پلٹیں ـــــ میں ہی آگے بڑھ گئی ـــــ !

میں ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتی بڑھتی رہی، چلتی رہی ـــــ ایک آدمی نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری۔ میں دکھ سے مسکرا دی ـــــ عورت کے لئے کہیں جائے فرار نہیں ـــــ یہاں ہر آدمی نواب ہے جو پیسے دے کر عورت کو خرید لینا چاہتا ہے ـــــ میں اس کے قریب پہنچی اور کمزور آواز سے بولی۔

"بھائی صاحب آپ .... ـــــ

اس نے ذرا غور سے میری صورت دیکھی اور پھر بوکھلا کر پلٹ گیا ـــــ "ہونہہ بھائی صاحب ـــــ !"

دنیا کس قدر گندی جگہ ہے ـــــ دیکھا تم نے ـــــ ؟ ایک مرد عورت کو آنکھ مار کر اشارہ کر سکتا ہے کہ چل میرے ساتھ ـــــ لیکن عورت اگر اسے بھائی کا سا پوتر رشتہ لگا کر سہارا مانگتی ہے تو وہ ہونہہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے ـــــ

میں نے پھر اپنے بے جان قدم بڑھائے ـــــ اتنے دنوں گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہی، چلو آج موقع ہاتھ آیا ہے تو دنیا اور دنیا والوں کو ایک نظر دیکھ تو لوں اور میں پھر چلنے لگی ـــــ صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام اور شام کے بعد رات آئی اور پھر سے میرے زخم جاگنے لگے۔ یہ زندگی کی پہلی رات تھی کہ میں اپنے گھر سے ـــــ اپنی ماں سے، اپنے بھائی سے دور رہ کر سوچ رہی

میں نے سوچا ـــــ چلتے چلتے میں قبرستان تک آنکلی تھی ؟؟ مگر کہاں ـــــ تھی
ہم جیسوں کا سب سے اچھا گھر تو یہیں بن سکتا ہے ـــــ مگر میں نے کہا ناکہ غریبوں کے لئے
جینے کی تو کوئی راہ ہے ہی نہیں، مگر مرنے کی بھی راہ نہیں ـــــ زندگی اپنے بس کی نہیں ـــــ
ـــــ موت بھی بس کی نہیں ـــــ چھوٹی بڑی قبروں کے بیچ میں وہیں لیٹ گئی ـــــ اور کوئی موقعہ
ہوتا تو شاید میں ڈر سے لرز لرز جاتی، مگر آج کی بات اور تھی ـــــ پے در پے صدموں اور تنہائیوں نے
جیسے ڈر کا احساس ہی چھین لیا تھا! اور میں مزے سے یوں قبر کے پہلو بہ پہلو لیٹی تھی جیسے سہاگ رات منا
رہی ہوں ـــــ

پھر صبح ہو گئی ـــــ مگر میری زندگی کی صبح کہاں تھی ـــــ ؟ اور کون جانے میرے نصیبوں
میں کتنی راتوں کی سیاہی لکھی ہوئی تھی ـــــ ؟؟ بھوک سے میری چال ڈگمگا رہی تھی ـــــ آنکھوں
میں سیاہ دھبے ناچ رہے تھے اور چکر کے مارے قدم اُٹھانا محال تھا، مگر میں چلی جا رہی تھی
ایک جگہ جا کر میں ٹھٹھک گئی ـــــ بہت سارے مرد، بچے اور چند عورتیں کسی کو گھیرے میں
لئے کھڑی تھیں، میں نے جگہ بنا کر، جھانک کر دیکھا ـــــ گھنگھروؤں کی تال پر کوئی الھڑ سی عورت
چھم چھم ناچ رہی تھی اور کوئی کوئی دل والا آنے دو آنے بھی پھینک دیتا تھا ـــــ !

" ہاں زندگی کا ایک روپ یہ بھی ہے ـــــ " میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا اور پھر
ہلکے ہلکے قدم اُٹھانے لگی ـــــ بڑی دیر چلتے رہنے کے بعد آخر میں ایک نیم کے نیچے بیٹھ گئی ـــــ
ـــــ " ناچنا شروع کر دوں ـــــ ؟" میں نے بہت صلاحیت کے ساتھ سوچا ـــــ پھر خیال آیا
عورت ہو کر تو زندہ رہنا ہی مصیبت ہے ـــــ دل والے مجھے کب زندہ چھوڑیں گے ـــــ ؟ اس عورت
کی بات اور تھی، اُس کے ساتھ اس کا ایک رکھوالا بھی تو تھا ـــــ عورت کے لئے رکھوالے کا وجود
بھی کس قدر ضروری ہے ـــــ ؟ بغیر سہارے کے تو یہاں پتہ بھی نہیں ہل سکتا ـــــ
ـــــ اُف ـــــ میں کسقدر نیچ ہو گئی ہوں ـــــ ! سڑکوں پر ناچنا ـــــ ؟ بھلا کس نے ایسی
ذلیل بات سوچی بھی ہو گی ـــــ ؟ اُف یہ پیٹ !! ـــــ

بھوک کا شدید احساس پھر سے جاگنے لگا اور میں للچائی ہوئی نگاہوں سے اُس فقیر کو دیکھنے لگی
جو ابھی ابھی پتے کے دونے میں سالن لئے چپڑ چپڑ روٹی سے کھا رہا تھا ـــــ میں نے بہت دیر تک
اُسے دیکھا ـــــ مگر اس نے میرا کوئی نوٹس نہ لیا، شاید وہ صورت سے مجھے کوئی بہت امیر کبیر لڑکی
سمجھ رہا ہو گا ـــــ بڑی دیر بعد میں نے کچھ اس انداز میں، جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں، کہنا شروع
کیا ـــــ (مگر دراصل میں اس فقیر سے مخاطب تھی) ـــــ
" میں بڑی دکھیا ہوں .... ـــــ

اُس نے ایک لمحے کو تو حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر دوسرے ہی لمحے ٹانگیں جھاڑتا ہوا یہ کہہ کر چل دیا ــــ "اوہ یہاں سبھی دکھی ہیں ــــ کون کس کس کا دکھڑا سنتا پھرے ــــ"

میں اس جگہ گئی جہاں وہ بیٹھا تھا ــــ روٹی کے چند ٹکڑے اِدھر اُدھر گر گئے تھے، میں نے جلدی جلدی ہاتھ مار کر سمیٹے اور ندیدوں کی طرح منہ میں بھرنے لگی۔

تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ــــ ؟؟ ہاں ہاں یہ میں تھی میں ــــ جو ایک فقیر کے آگے کے ٹکڑے چن چن کر کھا رہی تھی ــــ مگر مجھے اب حیرت نہیں ہوتی، کیوں کہ اس دنیا میں رہ کر میں نے جانا ہے کہ انسان کو ذلیل کروانے والا یہ پیٹ ہی ہوتا ہے ــــ خالی پیٹ ــــ اور یہ نہ بھولو کہ اُس لمحہ میرا پیٹ بھی خالی تھا ــــ

یہ دوسرا دن تھا جو میں گھر سے الگ تھی ــــ چند ٹکڑے کھا کر میری آگ اور بھڑک گئی۔

پتہ نہیں کیا جی چاہ رہا تھا ــــ کسے کھاؤں ــــ کسے پھاڑ ڈالوں ــــ میں دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی بڑھی۔ ایک جگہ کچرے کے ڈبے کے پاس کیلے کے چھلکے پڑے تھے۔ میں نے بغیر کسی تکلف یا شرم کے وہ چھلکے اُٹھائے اور جلدی جلدی منہ چلانے لگے ــــ اب میں پھر اسی نیم تلے آ بیٹھی تھی اور راہ گیر مجھے آتے جاتے بڑی شوق بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ــــ ایک موٹے سے سیٹھ نے مجھے حد درجہ مکروہ انداز میں آنکھ مار کر دیکھا ــــ میں نے متزلزل ہو کر اسے دیکھا ــــ پارسائی اور بے حیائی میں بڑی کشمکش ہو رہی تھی ــــ کوئی اِدھر کھینچ لیتا، کوئی اُدھر ــــ میں بیچ میں ادھ مری سی بیٹھی تھی۔

چھی چھی چھی ــــ یہ میں کیا سوچنے لگی ــــ کیا میں اتنی نیچ تھی ــــ ؟؟ کیا زندہ رہنا ایسا ہی ضروری ہے ــــ ؟؟ کیا پیٹ کے لئے انسان اتنا بھی نیچ ہو جاتا ہے ــــ پھر کیا یہ تم سوچ رہی ہو تم ــــ تم خاندانی روایات بھول گئیں ــــ دلّی کی تمہاری شاندار حویلی ــــ تمہارے گھرانے کی وہ عزت ــــ تمہاری وہ لوگوں کے لئے قابلِ تقلید زندگی ــــ اب تم اپنا جسم بیچو گی ــــ ؟؟ ہر رات ایک نئی سیج سجا کر نئے نئے مردوں کے ساتھ سویا کرو گی ــــ ؟؟ میں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں بھرلیں ــــ

"نہیں نہیں میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا بھی نہیں ــــ میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ بند کرو یہ بکواس ــــ"

اور پھر سب کچھ جیسے ساکت ہو گیا ــــ بیٹھے بیٹھے ہی جانے کتنے جگ بیت چلے۔ مگر وہ تصور کی دنیا تھی ــــ حقیقت تو یہ تھی کہ صرف سہ پہر کا وقت بیت رہا تھا اور دھوپ میں ترچھی ہو رہی تھیں ــــ میں بلا کسی ارادے اور مقصد کے یوں ہی بے دلی سے اُٹھی اور چلنے لگی۔ رُکی تو میں ایک ہاسپٹل کے سامنے تھی ــــ مریضوں کے رشتے دار آ جا رہے تھے اور کسی کو اتنی فرصت

نہ تھی کہ دو گھڑی کو رک کر میرا حال بھی پوچھ لیتا ___ اب دل برداشت کی حد سے اس طرح
باہر ہو رہا تھا کہ جی چاہتا تھا چلا چلا کر ساری دنیا کو سنا دوں ___ دیکھو میرے دل کے گھاؤ دیکھو
___ میں وہ بدنصیب لڑکی ہوں جسے اس کے سگے بھائی نے بیچ دیا ___ دیکھو روپے کی طاقت
کیسی ہوتی ہے کہ ماں جایا ایک بہن کے جسم سے خون کے فوارے اڑا دیتا ہے اور یہ پیٹ کی آگ.....

مگر کوئی نہ تھا ___ کوئی نہ تھا ___ چپراسی نے مجھے وہاں رکا دیکھ کر پوچھا ___

"اے لڑکی ___ تم وہاں کیوں کھڑی ہو ___"

میں نے خوشی خوشی زبان کھولی ___ "بابا ___ میرا اس دنیا میں اب......

"یہاں ہم لوگوں کے دکھڑے سننے نہیں کھڑے جی ___ ہسپتال میں جانا ہے تو جاؤ۔ ورنہ
راستہ چھوڑ دو موٹریں آ رہی ہیں ___"

تو یہاں کوئی نہیں ___ جو کسی بے کس کی ہائے ہی سن لے ___ یہ کیسی دنیا ہے
مولا تیری ___ یہ کیسی زندگی ہے خداوندا ___؟ میں راہ سے ہٹ کر ایک کھمبے سے لگ
کر کھڑی ہو گئی ___

میری زندگی میں آوارگی کا کوئی گزر نہ تھا ___ ورنہ ممکن تھا کہ میں بھی اپنے لئے کوئی راستہ
ڈھونڈھ ہی لیتی ___ مگر میں نے تم سے بتایا نا کہ میں ایک شریف اور اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔
___ بدچلنی کا میرے پاس ایک سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ___ اپنا جسم بیچ کر اپنے دوزخ کی
آگ بجھانا ___ اس فلسفے کو ماننے کی میرے دل میں تاب نہیں ___

میں پھر چلنے لگی ___ چلتے چلتے میں شہر کے پر رونق بازار میں آ گئی ___ ہر طرف رنگ
و بو کا سیلاب تھا۔ موٹریں اڑ رہی تھیں، عورتیں زرق برق کپڑے پہنے اتراتی پھر رہی تھیں ___
آدمیوں کا ہجوم تھا کہ بس چلا جا رہا تھا ___ ایک دریا کی مانند رواں دواں ___ میرے
دیکھتے ہی دیکھتے دو چار موٹریں رکیں، اسی طرح کھمبوں کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی عورتوں کو اشارے سے
پاس بلایا گیا اور موٹر زوں زوں یہ جا وہ جا ___

"بیٹھ جاؤں میں بھی کسی موٹر میں ___؟ میں نے دل سے سرگوشی کی ؟چھی چھی چھی ___
___ ایسا سوچنا بھی پاپ ہے ___ یہاں تو میں بس اس لئے کھڑی ہوں کہ زندگی کا تماشہ دیکھوں ___
___ میں جانے کب تک تماشہ دیکھتی رہتی کہ ایکدم کسی نے میرا کندھا تھپ تھپا کر کہا

"کیا آپ چند لمحے میرے ساتھ گزار سکتی ہیں ___؟"

میں نے لرز کر دیکھا ___ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا ___ نیلے سرج کے سوٹ میں ملبوس
سر کے بالوں میں اکا دکا سفید بال بھی چمک رہا تھا ___ اونچا قد اور چہرے پر عجب بے کسی چھائی

ہوئی ـــــ میں نے پھر اُسے غور سے دیکھا۔ اس کے تیور آوارہ گردوں کے سے نہ تھے ـــــ وہ خود بھی مصیبت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا ـــــ

"میں آپ ہی سے مخاطب ہوں ـــــ" وہ بڑی شائستگی سے بولا ـــــ کیا آپ چند لمحوں کے لئے چل کر اس ہوٹل میں میرے ساتھ بیٹھ سکیں گی ـــــ؟؟

میں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا اور جدھر اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا، ادھر چلنے لگی۔

ـــــ ہم دونوں ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے اور اس نے آگے بڑھ کر میرے لئے ایک کرسی کھینچ لیا اور خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا ـــــ

زندگی کا یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں کسی ہوٹل میں آئی تھی ـــــ میں حیران حیران نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی ـــــ چھت پر بجلی کے پنکھے چل رہے تھے ـــــ سارے میں کپوں اور برتنوں کی کھڑکھڑ ہو رہی تھی ـــــ سگریٹ اور سگار کے دُھویں بگولے کھا رہے تھے اور ٹھنڈی روشنیوں میں یہ سب کچھ عجیب خواب کی سی بات لگ رہی تھی ـــــ ہمارے اطراف چند مرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے ـــــ جیسے ہی اُنھوں نے مجھے دیکھا مسکرا مسکرا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

شاید میرے کپڑوں کی ہنسی اُڑا رہے ہوں! ـــــ میں نے دل میں سوچا اور بوکھلا کر نگاہیں جھکالیں ـــــ

ـــــ اس شخص نے بوائے کو جانے کیا کیا الا بلا لانے کا حکم دیدیا تھا اور اب میز لدی ہوئی تھی اور میری آنکھوں میں جیسے ستارے ناچ رہے تھے ـــــ اس نے محض تکلفاً "لیجئے نا" کہا اور میں جیسے پل پڑی ـــــ

وہ دھیمے سُروں میں گویا ہوا ـــــ

"آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ـــــ؟"

اس لئے اس جملے پر مجھے اپنے سارے دُکھ یاد آ گئے ـــــ میرا تیزی سے کام کرتا ہاتھ رُک گیا اور میں بے بسی سے بولی ـــــ

میں بہت بدنصیب لڑکی ہوں ـــــ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں کن مصیبتوں میں گھری ہوئی ہوں

ـــــ اس نے میری بات یوں ہی کاٹ دی ـــــ

"آپ اپنے دُکھ ایک لمحے کو اپنے ہی دل میں محفوظ رکھئے، پہلے میری بات سُنئے ـــــ"

مگر میں اُس کی بات نہیں سُن رہی تھی ـــــ کوئی بھی ایسا دل والا نہیں ملتا جو کسی غم نصیب کے دُکھ کو اپنے سینے میں منتقل کر لے وہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا ـــــ

"آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ـــــ؟؟ آپ جیسی عورتوں کو

رات گزارنے تو بہت سے مرد بے جاتے ہوں گے مگر ـــــ مگر اس کے بعد میں نے کچھ نہ سُنا ـــــ آپ جیسی عورتیں ـــــ آپ جیسی عورتیں ـــــ آپ جیسی عورتیں ـــــ

ہوٹل میں جیسے طوفان آ گیا تھا ـــــ بادلوں کی گرج اور جہازوں کی گھڑگھڑاہٹ سے بھی بڑھ کر کوئی گونج گرج تھی جو مجھے ہلا رہی تھی۔ تھرا رہی تھی ـــــ

ـــــ آپ جیسی عورتیں

آپ جیسی عورتیں ـــــ

میں نے کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے اور تیزی سے اُٹھ بھاگی ـــــ بھاگتے میں میز سے دو تین طشتریاں اور کپ لڑھک گئے اور برتنوں کے شور اور قہقہوں کی گونج میں، میں بھاگتی ہی چلی گئی ـــــ

ـــــ باہر آ کر میں نے لمبی سانس لی ـــــ

یہ میری پارسائی کا انعام تھا ـــــ یہ میری ریاضت اور پاکیزگی کا صلہ تھا ـــــ یہ دنیا ـــــ جہاں دلوں کا درد کوئی نہیں دیکھتا ـــــ تسلی کے دو بول کوئی نہیں کہتا مگر جہاں الزام خوب تراشے جاتے ہیں ـــــ عزتیں خوب لوٹی جاتی ہیں ـــــ کہاں جاؤں ـــــ ! کہاں جاؤں ـــــ میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا ـــــ آسمان روشن تھا۔ پاس پاس ستاروں کے گچھے چمک رہے تھے ـــــ اور ان سبھوں کے بیچ میں چاند تھا جو تیرتا چلا جا رہا تھا ـــــ ـــــ اپنی منزل کی طرف ـــــ

"مجھے بھی روشنی دیدے ـــــ مجھے بھی اُجالے دیدے ـــــ"، میں دکھے دل کو تھام کر بے بسی سے بولی ـــــ میں بھی اپنی منزل کو جانا چاہتی ہوں ـــــ مجھے روشنی چاہئے ـــــ مجھے زندگی چاہئے ـــــ

اور میں وہیں گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھ گئی ـــــ اور پھر میں نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے میں زمین پر گری جا رہی ہوں ـــــ میرے کانوں میں شور کی آوازیں اور راہگیروں کے قہقہے ہلکے اور ہلکے ـــــ اور ہلکے ہوئے جا رہے ہیں ـــــ میرے سامنے ہسپتال کی بلند وبالا دیواریں تھیں اور ـــــ پھر کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا ـــــ

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو بستر پر پایا ـــــ میں ہسپتال کے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ سفید سفید لباس پہنے ٹک ٹک کرتی نرسیں اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر آ جا رہی تھیں۔ اسٹیتھ سکوپ گلے میں ڈالے ڈاکٹر، مریضوں پہ مہربان نظریں ڈالتے ہوئے آ جا رہے تھے ـــــ ایک نرس قریب سے گزری تو میں نے پوچھا ـــــ

"مجھے یہاں کس نے لا کر ڈال دیا ہے ـــــ ؟"

نرس رک کر بولی ——— "ہمارے کو نہیں معلوم ——— مریضوں کو اُدھر سے اڈمٹ کرتے
——— کوئی تمہارے بھائی بند ہی لا کر ڈالے ہوں گے ———"

"میرا بھائی بند ——— ! ہونہہ ! ایک زہر خند مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی ———
دو دن میں نے ہاسپٹل میں کاٹے ——— نرسیں مشین کی طرح مصروف رہتیں
ڈاکٹر ٹائم سے آتے اور جلدی جلدی چلے جاتے ——— بازو کے بیڈ والے پیشنٹ کو اپنی ہائے
ہائے سے فرصت نہ تھی ——— پورا وارڈ ہی آہوں اور کراہوں کا مسکن تھا ——— کون کس کا
دکھ سننے چلا تھا ———

ایک دن میں نے ڈاکٹر کے کوٹ کا دامن تھام ہی لیا ——— "ڈاکٹر صاحب
میرے دل میں ہر دم ایک آگ سی لگی رہتی ہے ——— ! اس آگ کو بجھانے کی کوئی صورت
بھی ہے ——— ؟

ڈاکٹر صاحب نے نرس کو آواز دی ——— "سسٹر ——— ٹمپریچر لو ——— دماغ پر گرمی
کا اثر معلوم ہوتا ہے ——— بڑبڑا رہی ہے ———" میں نے تکیئے پر سر پٹخ دیا ——— "میں
پاگل نہیں ہوں ——— میرے دماغ پر گرمی نہیں ہے ——— میں سب کچھ سوچ سمجھ سکتی ہوں
——— سب جانتی بوجھتی ہوں، مگر میں کہتی ہوں کوئی مجھ سے کبھی ہمدردی بھی جتائے گا یا میں یوں
ہی مر جاؤں گی ——— ؟

——— نرس نے آکر لال شال سر سے پیر تک اڑھا دی ———

"اتنا ہنگامہ مت کرو بی بی ——— دوسرے پیشنٹ جاگ جائیں گے ———" اور وہ میرے
منہ میں تھرمامیٹر کی نلکی دے کر چلی گئی ———

میں نے تھرمامیٹر منہ سے نکال کر رکھ دیا اور جب نرس آئی تو اس سے بڑی لجاجت سے بولی۔
——— "مجھے کھانا چاہیئے۔ بھوک لگ رہی ہے ———"

"اتنے بخار میں کھانا نہیں دیا کرتے ——— چین سے سو جاؤ ——— اُٹھنے کے بعد دودھ
پی لینا ——— موسمبی یہ رکھی ہے ———" اور وہ بڑبڑاتی چلی گئی

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا ——— ڈاکٹروں کی راؤنڈ کا ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ نرسیں اپنے اپنے
کاموں میں تھیں ——— مریض بستروں پر پڑے ہائے وائے کر رہے تھے۔ پورے وارڈ میں عجیب
سناٹا پھیلا ہوا تھا ——— کیسی غیر دلچسپ زندگی ہے خدایا۔ دو ایک دن میں ڈسچارج ہو جاؤں
گی ——— پھر وہی زندگی اور وہی زندگی کے ستم ! یہ دو دن کا آرام بھی کون بھلا لگ رہا ہے مجھے
——— ؟ میں نے پڑے پڑے موسمبی کھائی اور دھیرے دھیرے اپنے جسم کو اٹھ بیٹھنے پر آمادہ کیا

بڑے سے وارڈ میں سے ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی میں باہر نکل آئی ـــــ دروازے پر

چپراسی نے پوچھا ـــــــــ

"کہاں جا رہی ہو ـــــ"

"گھر ـــــ"، میں ایک ہی لفظ بول سکی ـــــ اور اس ایک لفظ نے پھر میرے

دل میں غم ہی غم بھر دیا ـــــــ

وہ غیر یقینی انداز میں بولا ـــــ "مگر ٹکٹ کہاں ہے ـــــ؟"

میں چڑ کر بولی ـــــ "تو کیا میں یوں ہی بھاگی جا رہی ہوں ـــــ؟"

میرے لہجے سے وہ ذرا سہم گیا اور وہ باز ہٹ گیا ـــــ میں دھیرے دھیرے ہسپتال

کے گیٹ سے باہر نکل گئی ـــــ

اور آج پانچواں دن ہے کہ میں گھر سے باہر ہوں ـــــ اس گھر سے بھی جہاں میں اپنی ماں

اور بھائی کے ساتھ رہتی تھی اور اُس گھر سے بھی جہاں تصوّر ہی میں سہی مگر میں اپنے شوہر اور چھ بچوں کے

ساتھ سکون سے رہتی تھی ـــــ گھر جس کی لال اینٹوں کی دیواریں تھیں اور جس کے پھاٹک پر بوگین

اوڈیلیا کے ترمزی رنگ کے پھول، ہرے ہرے پتّوں میں چھپے مسکراتے جھومتے تھے ـــــ!

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ـــــ؟!

وہی حیدر آباد کی سڑکیں تھیں ـــــ وہی راہگیر ـــــ وہی چہل پہل ـــــ اور

وہی میں، جس کا دل قبرستان تھا ـــــ جہاں کئی آرزوئیں پہلو بہ پہلو سو رہی تھیں ـــــ جنھیں

خدا کا ہاتھ بھی زندہ نہیں کر سکتا تھا ـــــ!

میں بھوک سے نڈھال تھی۔ میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا ـــــ میری ساڑھی دھول اور

گرد سے اَٹ گئی تھی، میرا دل دُکھی تھا، جسم بے جان اور میرے آس پاس مکروہ چہرے تھے اور

بھوکی نگاہیں ـــــ دل جیسے بار بار سمجھاتا تھا ـــــ

ایک راستہ ہے ـــــ ایک ہی راستہ ہے ـــــ چل پڑو ـــــ چل پڑو

ـــــ پھر نہ دُکھ ہوں گے نہ غم ـــــ بس خوشیاں ہی خوشیاں ـــــ ہاں ایک ہی راستہ ہے۔

ـــــ کیا اس راستے کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہے ـــــ؟! کیا دنیا میں ایک بے سہارا عورت

کے لئے سوائے چکلے کے اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے ـــــ؟ کیا سارے راستے اسی منزل پر آ کر

ختم ہوتے ہیں ـــــ؟؟

اور یونہی قدم اُٹھاتے اُٹھاتے میں تم تک آ پہنچی ـــــ در جیسے میرے دل میں ایک ساتھ

کئی چراغ جل اُٹھے ـــــ

... ارے مجھے پتہ ہی نہ تھا ـــــ تم سے بڑھ کر اور کون منزل ہو سکتی ہے ـــــ ؟ تم نے کتنوں کو سہارا دیا ہے ـــــ ؟ کتنوں کے غموں کی پردہ پوشی کی ہے، کتنی آنکھوں کی فریادیں سنی ہیں ـــ کتنے دکھوں کو اپنے دل میں جگہ دی ہے میں ـــــ میں بھی تو اسی درد کی ماری ہوں ـــــ مجھے بھی تو یہاں پناہ مل سکتی ہے نا ـــــ !! اے دریائے موسیٰ ـــــ

ـــــ اے مہربان!

میں نے اپنے گرد آلود پاؤں پانی میں ڈال دیئے اور تم سے باتیں کرنے لگی ـــــ انسانوں کے دلوں سے اچھا تو تمہارا دل ہے ـــــ تم میری پکار اور غم زدہ آواز سن کر بھاگے نہیں ـــــ ورنہ یہاں کون کسی کا دکھ سمیٹتا ہے۔ تم اسی متانت اور سکون سے بہہ رہے ہو ـــــ تمہارے دل میں ساروں کے غم سمیٹ کر بھر لینے کی وسعت ہے ـــــ اوروں کی طرح تم نے بےزار ہو کر منہ نہیں پھیرا، ہاتھ نہیں جھٹکا، طعنے نہیں دیئے اور غور سے میری باتیں سنتے رہے ـــــ

کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں ـــــ ہاں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں بس خواب میں ہی تو نظر آتی ہیں ـــــ رستی بستی زندگیاں اور کیسے اجڑا کرتی ہیں ـــــ ؟؟ تمہارا یہ سکون ـــــ تمہاری یہ خاموشی ـــــ کیا سچ تم نے میری باتیں غور سے سنی ہیں ـــ ؟! ہاں ہاں سنی ہیں، تبھی تو میرے دل کا بوجھ اب ٹل گیا ہے ـــــ میں ہوا کی طرح ہلکی ہو گئی ہوں ـــــ تمہارے دل کا سکون میرے اپنے دل میں رچ بس گیا ہے اور میں اب مرتے مرتے کسقدر مطمئن ہوں۔

ـــــ کس قدر خوش ـــــ !

کیسی یہ نہ کہنے لگنا، کس قدر بزدل اور ڈرپوک تھی جو یوں دنیا سے منہ پھیر لیا ـــــ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ مجھ ایسی لڑکی کے لئے آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اور کون راستہ تھا ـــ ؟؟ اور کون منزل ہو سکتی تھی ـــــ ؟؟ میں نے تو بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے ـــــ اور میں اب کس قدر خوش ہوں ـــــ میں اب دھیرے دھیرے پانی میں اُتر رہی ہوں ـــــ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی میرے جسم کو چھو رہا ہے ـــــ اور میں زندگی سے قریب ـــــ اور قریب ـــــ اور قریب ہوتی جا رہی ہوں ـــــ

محمود تیمور

عربی کہانی

ترجمہ: ظہور احمد اظہر

شہرت کی موت

"جی ہاں، قاتل میں ہوں۔ مس منزّہ کو میں نے قتل کیا ہے۔"

یہ الفاظ میں نے پولیس انسپکٹر سے کہے تھے اور اس نے فوراً مجھے گرفتار کر کے حوالات میں بند کرنے کا حکم دیا تھا۔ تفتیش کا سلسلہ جاری تھا اور میں برابر یہی کہتا رہا کہ قاتل میں ہی ہوں.... اب مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ میری بات پر یقین کرنے لگے ہیں۔ مجھے قاتل تسلیم کر لیا گیا۔ اور سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ چند دن کے بعد پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ہوگا۔ لیکن میں اس بات سے کب ڈرتا ہوں؟

اعترافِ قتل کے بعد میری زندگی کے جو لمحات گزرے انھیں عرفانی لمحات کی حیثیت حاصل ہے۔ تقدیر نے انھیں میری کتاب زندگی میں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ یہ لمحات میری زندگی کا نچوڑ ہیں۔ کتنے شاندار دن ہیں یہ جو اس عظیم جیل خانے میں میں گزار رہا ہوں۔ شہرت و عظمت کے دن! ایک ایسی شہرت اور عظمت جو یکایک مجھے مل گئی ہے۔

اسی حصول عظمت کی خاطر میں نے پولیس انسپکٹر کے سامنے بڑے فخریہ انداز میں قتل کا اعتراف کیا تھا۔ اب میں کوئی معمولی انسان نہیں تھا۔ میری عظیم شخصیت سورج کی طرح روشن ہوگئی اور چار دانگ عالم میں میرے نام کی حکمرانی تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس سے پہلے میں ایک معمولی سا آدمی تھا۔ ظاہر و باطن میں گھٹیا گفتگو میں گھٹیا، ہر چیز میں گھٹیا، بے اثر شخصیت، نہ رنگ نہ شکل، بالکل بے معنی انسان تھا میں مجھے یاد نہیں کہ کبھی بھی کسی نے مجھے کوئی اہمیت دی ہو۔ میں لوگوں کے پاس سے

گزرتا۔ لیکن کوئی بھی مجھے نظر اٹھاکر نہ دیکھتا، میں جب مجلس میں بیٹھتا، تو میری بات بھی کوئی نہ سنتا۔ بلکہ میری موجودگی کا کسی کو احساس تک نہ ہوتا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ لوگوں کو کسی طرح اپنی طرف متوجہ کرسکوں۔ مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

میری بے رقعتی کا اندازہ فرمائیے کہ لوگ مجھے اپنی حقارت و تذلیل کا بھی مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ کسی نے مجھے دھکے، لات، یا تھپڑ کا شرف بھی نہ بخشا۔ جس سے مجھے یہ احساس ہوسکتا کہ میں بھی عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوں۔

میں نے کچھ معمولی سی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ مگر مجھے اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا، کیوں کہ میں نے بے کار، بلکہ بے معنی اور گمنام زندگی اختیار کرلی تھی۔ مجھے کوئی عورت ایسی نہ ملی جو مجھے اپنا شوہر بنانے کے لئے تیار ہوتی، چنانچہ میں نے اپنی عمر کے پورے تیس سال شادی کی خواہش میں ہی گزار دیئے۔

ایک چھوٹے سے فلیٹ میں میں تن تنہا رہتا تھا۔ میرا زیادہ وقت چائے کی دوکان کے ایک گوشے میں گزرتا تھا۔ چائے کی دکان اور میری رہائش کے درمیان ایک چھوٹی سی سڑک تھی جس پر سے صبح و شام میں گزرتا تھا... اس دکان میں بیٹھے ہوئے میں اخبارات پڑھتا، ریڈیو سنتا، یا کبھی کبھار آنے جانے والے مجھے دیکھ کر مسکرا دیتے یا کوئی لفظ کہہ دیتے جو ہمیشہ بے معنی ہوا کرتا تھا۔

میں اسی وحشت و تنہائی کے عالم میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا کہ ایک صبح اخبار کے پہلے صفحہ پر میری نظر پڑی جس میں مس منزہ کے قتل کی خبر جلی سرخیوں کے ساتھ لکھی ہوئی تھی۔ وہی مس منزہ جو اونچے طبقے کی ایک خاتون تھی جسے اخبار پڑھنے والا ہر شخص جانتا تھا۔ وہ بہت ہی حسین، بلا کی مستعد اور سخی تھی۔ اور عورتوں کی بہبود سے گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ اس خاتون کو کسی نامعلوم شخص نے قتل کر دیا تھا۔ اور اس کا قتل پولیس کے لئے ایک سربستہ راز بنا ہوا تھا۔

قتل کی پر اسراریت مجھے بہت پسند آئی اور میں اخبارات میں اس کی تفصیل بڑے شوق سے پڑھتا رہا۔ اور قتل کے واقعات میں اس طرح گھل مل گیا جیسے میں بھی اس خوفناک ڈرامے کا ایک ہیرو ہوں۔

اس مقدمے میں میرے لئے سب سے زیادہ باعث کشش قاتل کی شخصیت تھی، کتنا چالاک، ہوشیار قاتل تھا، کتنی پختگی، باریکی، اور احتیاط سے اس نے اپنا کام کیا، اور پھر یوں روپوش ہوا کہ اس کا سراغ بھی نہ مل سکا۔ وہ جرائم کی دنیا کا دیوزاد تھا۔

ایک دن میں اخبار میں مقدمے کے متعلق ایک ادایہ پڑھ رہا تھا کہ میرے تحت الشعور میں ایک انجانی سی لہر پیدا ہوئی اور مجھ پر اداسی کا شدید حملہ ہوا۔ میرا دل ذلت و پستی اور مایوسی اور بے اتفاقی کے احساس میں ڈوبا ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم دریائے نیل کے پل کی طرف اٹھنے لگے۔۔۔۔ میں پل پر جاکر ایک ریلنگ کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ اور نیل کی طلاطم خیز لہروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ میں کافی دیر تک پانی کی ابھرتی اور بپھرتی موجوں کو دیکھتا رہا، پھر معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پانی میں سے ایک مخفی قوت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ میرے ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ میں ڈگمگا گیا۔۔۔ میں پانی میں گرنے کو تھا کہ اچانک ایک طاقت ور ہاتھ نے مجھے پیچھے سے تھام لیا۔ میں سنبھل گیا۔ ایک پولیس کا سپاہی مجھے بازو سے پکڑے کہہ رہا تھا۔

"ارے کم بخت کیوں اپنے آپ کو ختم کرنے لگے ہو۔؟"

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اسے کیا جواب دیا۔ بہت جلد راہگیروں کا ایک ہجوم جمع ہوگیا وہ گھور گھور کر مجھے دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے!

یہ تو خودکشی کرنے لگا تھا۔۔۔۔!"

سپاہی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے ہجوم سے نکال لایا۔ کچھ دیر ہم چلتے رہے اور وہ مجھے نصیحتیں کرتا رہا اور میرے لئے خدا سے دعائیں مانگتا رہا۔

میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ لوگوں نے میرے وجود کو محسوس کیا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ خودکشی کی کوشش کر کے میں نے گمنامی سے نکلنے کے لئے ایک قدم بڑھایا تھا۔ جلد ہی مجھے سب بھول گئے، اب کسی کی زبان پہ میرا اچھا یا برا ذکر نہ آتا تھا۔۔۔ اور میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا کہ کیوں نہ میں گمنامی کے آہنی حلقے کو توڑ ڈالوں اور میں ہیرو بن جاؤں۔ میں اپنی زندگی کو مسز منزہ کی زندگی سے کیوں نہ وابستہ کر دوں جکی موت زندگی سے بھی زیادہ عظمت اور شہرت کی حامل بنی تھی۔ میں خود کو اس مقدمے میں

ملوث کیوں نہ کر دوں.... اس کا قاتل بن جاؤں۔!!

ٹھیک ہے، میں ہی اس کا قاتل ہوں... میں نے رقابت اور حسد کی وجہ سے اسکی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔

اور میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر ایک کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہے میں پوری قوت سے چلا رہا تھا۔

"قاتل میں ہوں.... مس منزّہ کو میں نے قتل کیا ہے...."

کچھ دیر بعد میں پولیس انسپکٹر کے سامنے تھا۔ پولیس کے سپاہی مجھے ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا ہجوم میرے گرد جمع تھا۔ میں سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جلد ہی نامہ نگاروں کی ایک جماعت بھی پہونچ گئی، کیمروں کی روشنی آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔ کیمروں کے رخ میری طرف تھے۔ میری تصویر پر تصویر اتاری جا رہی تھی۔ ہجوم شدت اختیار کر گیا۔ میں سب کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ لوگ میری طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر اشارے کر رہے تھے۔ میں ان کی گفتگو کا مرکزی کردار تھا۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے

اور پھر میں نے عظمت کے گھومتے ہوئے لٹو پر سے دنیا کو جھانکنا شروع کیا، تاکہ اپنی حقیقت معلوم کر سکوں... میں نے دیکھا کہ اب میں ایک عظیم انسان بن چکا ہوں، پولیس انسپکٹر گھنٹوں میرے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ سوال کرتا اور میں جواب دیتا۔ گفتگو کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ میں ایک عظیم لیڈر ہوں جس کے جوابات پولیس انسپکٹر کو حیرت میں ڈال رہے ہیں۔ مجھے اپنے بڑے پن کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔

میری گرفتاری کی خبر تمام اخبارات نے صفحہ اوّل پر جلی سرخیوں میں شائع کی۔ اور میرے مختلف زاویوں سے لئے ہوئے فوٹو بڑے اہتمام سے اخبارات کی زینت بنے میرے ساتھ مقتولہ خاتون کی تصویر بھی شائع ہوئی۔ بڑی خوبصورت اور دلکش تصویر تھی۔ ہم دونوں کی تصاویر پہلو بہ پہلو یوں نظر آتیں جیسے ہم دولہا اور دولہن ہیں اور تمام دنیا ہماری شب عروسی منانے کے لئے جگمگا اٹھی ہے۔

اخبار نویس اور فوٹو گرافر تو ہر وقت میرے ساتھ لگے رہتے اور بڑی کوشش کے

کے بعد جب کوئی جملہ کہلوانے میں کامیاب ہو جاتے تو فوراً اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتے۔۔۔

میری اور مس منزہ کی داستان کے متعلق خبریں شائع کرنے میں تمام اخبارات کے درمیان مقابلے کی دوڑ شروع ہو گئی اور کامیاب اخبار وہ تھا جس میں کوئی بات گھڑ کے دے دیتا۔

تفتیش کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں پولیس انسپکٹر سے روداد حوادث بیان کرتا رہا۔ ایک دفعہ انسپکٹر نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں نے اس مجسمہ حسن وناز کو کس طرح ابدی نیند سلا دیا میں نے تفصیل بیان کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی۔ میری قوت تخیل برق رفتاری سے حیرت انگیز اور سنسنی خیز تفاصیل کی تخلیق پر قادر ہو گئی تھی۔

پولیس انسپکٹر میرا بیان سن رہا تھا اور دہشت و حیرانی سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا بلکہ میں تو خود حیرت میں ڈوبا ہوا اپنے الفاظ سن رہا تھا۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا یہ میں خود بول رہا ہوں۔ بلاشبہ میں ایک عظیم انسان ہوں اور عظیم اس لئے کہ میں نے لوگوں کے سامنے ایک حیرت انگیز عظیم جھوٹ گھڑ کے پیش کیا تھا اور لوگ اسے بڑے وثوق کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے!

اس وقت مجھ پر ایک نہایت ہی اہم راز منکشف ہوا۔ اور وہ یہ کہ ہر اہم شخصیت کی زندگی میں ایک "جھوٹ" ہوتا ہے اور یہ جھوٹ جس قدر سفید ہوتا ہے اسی قدر اس شخصیت کو شہرت و عظمت نصیب ہوتی ہے۔ اب مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ میں بھی عظیم صلاحیتوں کا مالک ہوں، ایک یکتائے روزگار، اور عظیم شخصیت بننے کے لئے مجھ میں کسی چیز کی کمی نہیں طویل عرصے کی گمنامی اور فراموشی کے بعد میں نے خود کو پایا ہے۔

ہر فرد و بشر کی موت کا ایک دن معین ہے اس لئے میں اطمینان کے ساتھ موت کو لبیک کہنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے جس شہرت و عظمت کی تمنا تھی میں نے اسے پا لیا۔ کل مجھے تختۂ دار پر چڑھ جانا ہے۔ مرحبا اے تختۂ دار میں اب سولی پر چڑھوں گا تو میری شہرت کی روشنی دنیا کی آنکھوں کو چوندھیا رہی ہوگی۔ ہر ایک کی زبان پر میرا نام ہوگا۔ اور جگہ جگہ میری محبت بھری داستان کے چرچے ہوں گے۔ گمنامی کی زندگی اگر حضرت خضر جتنی بھی ہو تو کس کام کی شہرت کا ایک لمحہ حیات جاوداں بخش دیتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ جھوٹ کے ذریعہ میں نے یہ ابدی زندگی حاصل کر لی۔ شہرت کی موت زندہ باد۔۔۔۔!

ایم رحمٰن شیخ
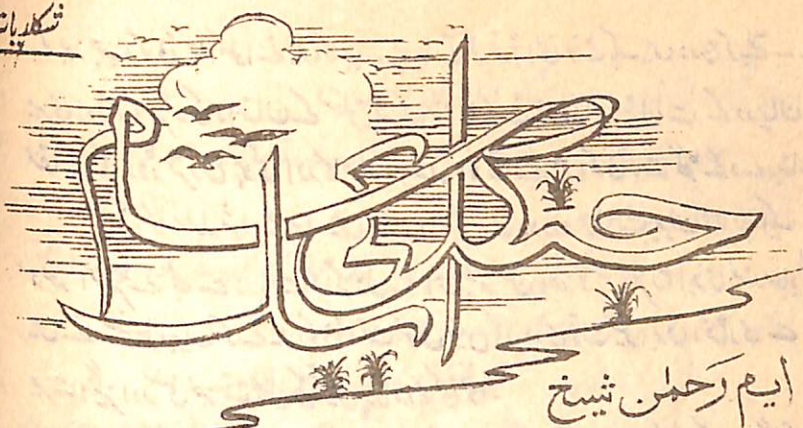
میں اپنے علاقہ کا واحد شخص ہوں جو جنگل سے جڑی بوٹیاں تلاش کر کے "بلہورا" کے حکیموں اور ویدوں کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتا تھا۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی جنگلوں کی خاک چھاننا شروع کر دی تھی اور اب میری عمر چالیس سے متجاوز کر چکی ہے لیکن میرے تنومند، سرخ و سفید اور چست جسم کو دیکھ کر لوگ مجھے کم عمر کا سمجھتے ہیں۔

جڑی بوٹیوں کے علاوہ کبھی کبھی جانوروں کے نوزائیدہ یا شیر خوار بچے بھی میرے ہاتھ لگ جاتے تھے جنھیں "بلہورا" کے چڑیا گھر والے خوشی خوشی سے خرید لیا کرتے اور کبھی جنگل کی سر بفلک پہاڑوں پر مجھے کچھ ایسے قیمتی پتھر مل جاتے تھے جن کے عوض میری مالی حالت کچھ دنوں کے لئے درست ہو جاتی تھی اس قدر مشقت کے باوجود میں خوشحال نہ ہو سکا۔

میرے پاس ایک موروثی بندوق تھی جسے چلانے کی مجھے بہت کم ہی ضرورت پیش آتی تھی۔ لیکن ایک دفعہ اسے ایک ایسے موقعے پر استعمال کرنا پڑا جو میری زندگی کا ناقابل فراموش لمحہ بن گیا۔

یہ گرمیوں کی ابتدا کا واقعہ ہے۔ ان دنوں پریشاں حالی مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ میں صبح سے قیمتی پتھروں کی تلاش میں جنگل کے اس حصے کی طرف روانہ ہوا جس طرف پہاڑوں کا وسیع سلسلہ تھا۔ میں نے فوجی جوتے پہن رکھے تھے جو خاردار جھاڑیوں سے میرے پیروں کی حفاظت کر رہے تھے۔ ایک کمبل، میری بندوق کندھے پر اور راستہ صاف کرنے کے لئے ایک خاص ہتھیار "داؤ" میری کمر سے ٹنگا ہوا تھا، خورد و نوش کا تھیلا پیٹھ پر تھا۔ اب ڈھلوان شروع ہو چکی تھی، میری بائیں جانب ایک چشمہ تھا جس کا پانی نہایت ہی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ کچھ دور آگے پہاڑیوں کا دامن تھا جہاں سے مجھے عمودی چٹانوں پر چڑھنا تھا۔ دامن میں پہونچ کر بلندی پر روانہ ہونے سے قبل مجھے بھوک کا احساس ہوا اور

میں نے وہیں ایک بڑے درخت کے نیچے اپنا کمبل بچھایا، کھانے کی چیزیں تھیلے سے نکالیں، کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر کے لیے سستا لینا بھی مناسب معلوم ہوا کیوں کہ آگے ایک بڑا مرحلہ طے کرنا تھا۔ عمودی راستوں پر چڑھنا جان جوکھوں کا کام ہے ... ابھی مجھے آرام سے لیٹے کچھ زیادہ لمحے نہ گزرے تھے کہ میرے نتھنوں نے ایک مخصوص بو کو محسوس کیا۔ میرے حساس نتھنوں نے خطرے کی قربت کا احساس دلایا اور میں چوکنا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ نہایت تیزی سے میں نے اپنا سامان سمیٹا میرے لیے اس بو کی سمت اور مرکز کا پتہ لگانا بہت ضروری تھا۔ سمت کا اندازہ کر لینے کے بعد میں نے بلندی کی جانب قدم بڑھائے اوپر چڑھتے ہوئے میں اس قدر محتاط تھا کہ اگر پتا بھی کھڑکتا تو میری بندوق کا رخ اسی سمت ہو جاتا۔ میری دائیں اور بائیں جانب نشیب میں اضافہ ہوتا گیا، کانٹے دار جھاڑیوں نے میرے لباس کو جگہ جگہ سے کھرچنا شروع کر دیا تھا۔ میں بے آواز آگے بڑھتا رہا، اچانک اس بو میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ میری نظریں گرد و پیش کا نہایت تیزی سے جائزہ لینے لگیں مجھے صرف پندرہ گز کے فاصلے پر شیروں کا ایک جمگھٹا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی میں فوراً بیٹھ گیا، ورنہ میرا دیکھ لیا جانا یقینی تھا۔ اتنی تعداد میں بیک وقت شیروں سے کبھی میرا سابقہ نہ پڑا تھا۔ میں نے خوف کی ایک تیز لہر جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ موت کے بھیانک سایوں کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر میرے ہوش و حواس ڈگمگانے لگے۔ آگے بڑھنا خودکشی تھا اور لوٹنا بھی موت کی آغوش میں جانے کے مترادف تھا۔ ذرا سی آواز شیروں کو میری طرف متوجہ کر دیتی اور دوسرے لمحے میرے جسم کی بوٹیاں فضا میں بکھر چکی ہوتیں۔

میں نے ارد گرد درختوں کا جائزہ لیا۔ قریب ترین درخت کا فاصلہ کم از کم دس گز تھا جان بچانے کی سب سے اچھی صورت یہی تھی کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر درخت پر پناہ لی جائے۔ میں نے نہایت آہستگی سے لیٹے لیٹے درخت کی جانب سرکنا شروع کیا۔ خاردار جھاڑیاں رکاوٹ بننے لگیں۔ میں بار بار شیروں کے اس غول کی طرف دیکھ لیتا۔ ابھی نصف فاصلہ ہی طے کر سکا تھا کہ اچانک اکھڑے ہوئے پتھر پر میرا پاؤں پڑ گیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ میں نیچے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ اگر قدرت میری مدد نہ کرتی تو میں کسی خوفناک گڑھے میں جا گرتا۔ میری قمیص کا دامن ایک جھاڑی سے اٹک گیا۔ اور ساتھ ہی میرے قدم ایک پتھر پر جم گئے۔ میں نے سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میرا پاؤں پھر پھسل گیا اور میں دو سو گز نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے کچھ ہوش آیا۔ میں درختوں کے جھنڈ کے قریب آ گیا تھا۔ میں نے اٹھ کر دوڑنے کی کوشش کی لیکن چکرا کر گر پڑا۔ ایک دو لمحوں کے بعد میں پھر اٹھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیروں کو میری موجودگی

کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ سب کے سب ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھتے ہی میں اٹھ بیٹھا معلوم نہیں اس وقت مجھ میں کہاں سے طاقت آ گئی۔ میں بے تحاشا قریبی درخت کی طرف دوڑا جلدی سے بوٹ اتارے اور درخت پر چڑھنے کے لئے آگے بڑھا۔ شیروں کی نظریں مجھے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ سب کا رخ میری جانب تھا۔ اچانک ایک بوڑھا شیر میری جانب جھپٹا وہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں درخت تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا، درخت کی پہلی شاخ کا فاصلہ مجھ سے دو فٹ تھا۔ فوراً ہی میں نے اس شاخ کو دائیں ہاتھ سے پکڑا۔ اور جسم کو جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔ ٹھیک اسی وقت اس درندے کی غراہٹ سنائی دی۔ اس نے چھلانگ لگائی اور میری ٹانگ سے اس کا فاصلہ صرف ایک انچ کا رہ گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا بدن کپکپا رہا ہے ہاتھ لرز رہے ہیں۔ میری گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ یا اضطراب کیا ہوگا؟ کیا میں ان درندوں کا لقمہ بن جاؤں گا۔ زندگی سے محبت نے مجھے ایک نیا عزم عطا کیا۔ ابھی میں محفوظ مقام تک نہ پہنچا تھا ایک اور شاخ طے کرنا ضروری تھی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ دوسری شاخ مجھ سے پانچ فٹ اوپر تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے پکڑا اور اس کی مضبوطی کا اندازہ لگانے کے لئے ایک جھٹکا دیا۔ چٹاخ کی آواز آئی۔ خوف و دہشت سے میری چیخ نکل گئی۔ میرے پیروں کے نیچے کی شاخ ٹوٹ کر گر چکی تھی اور میں دوسری شاخ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے لٹک رہا تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر مجھے ان درندوں کی خوراک بنا دیتی۔ یہ سوچ کر میں لرز گیا نیچے جنگل کا خونی شہنشاہ گرج رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اپنے جسم کو اوپر کی طرف اچھالا۔ شاخ مضبوط تھی۔ چند لمحوں کے بعد میں اتنی اونچائی پر پہنچ گیا جہاں میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکتا تھا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس منحوس درخت پر پناہ لینے کی بہ نسبت ان درندوں کی خوراک بن جانا زیادہ آرام دہ تھا۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا۔ اب تمام شیر درخت کے نیچے آ چکے تھے۔ صرف دو۔ جو یقیناً مادہ تھیں، چٹان پر ہی تھیں اسوقت مجھے پتہ چلا کہ ان کے ساتھ تین نوزائیدہ بچے بھی ہیں جن کی آنکھیں بھی ابھی بند ہیں۔ شاید وہ کل ہی پیدا ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے لئے میں اطمینان اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ اچانک مجھے بندوق کا خیال آیا۔ وہ میرے ساتھ نہ تھی اسے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ یہ کیا ہوا؟ میں نے نیچے نظر ڈالی۔ درخت سے دو گز کے فاصلے پر میری بندوق پڑی تھی۔ وہ کس وقت مجھ سے جدا ہوئی مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ اب کیا ہوگا؟ میں اس کے ذریعے اوپر ہی بیٹھے بیٹھے ان درندوں کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ لیکن میں اب بالکل بے بس

تھا، درخت پر بیٹھے بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرنے سے یہ کہیں بہتر ہوتا کہ ایک ہی بار خاتمہ ہوجاتا مجھے درخت پر پناہ لینا ایک نئی مصیبت معلوم ہونے لگا۔ اس وقت کی کیفیت ناقابل بیان ہے۔

ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ شاید یہ درندے کچھ دیر بعد یہاں سے چلے جائیں لیکن یہ میری طفل تسلی تھی۔ میں نے خورد و نوش کے تھیلے کو پیٹھ سے اتارا اور سامان کا جائزہ لیا۔ میرے پاس دو دن کی خوراک تھی۔ کاش درندوں کا یہ قافلہ اس عرصہ میں میرا پیچھا چھوڑ دے۔ اب میرے پاس ایک ہی ہتھیار تھا۔ اور وہ تھا "داؤ"، دو بدو جنگ میں اس سے کام لیا جا سکتا تھا۔ لیکن بیک وقت تیرہ شیروں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ وقت اور گزرا۔ اب سورج ڈھل چکا تھا، اس کے غروب ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میرے ذہن میں نیا خیال ابھرا کہ مجھے رات گزارنے کے لئے جگہ بنا لینی چاہیئے۔ قدرت جو ہماری خالق ہے، ہماری محافظ بھی ہے وہی میری نجات دہندہ ثابت ہوگی۔ پہلو بدلتے ہی زور کی ٹیس میرے دائیں گھٹنے میں اٹھی اور اس وقت مجھے اپنی چوٹوں اور چہرے کی خراشوں کا احساس ہوا۔ میں نے آہستہ سے اپنے چہرے کو قمیص کے دامن سے پونچھا۔ گھٹنے کو دو چار بار ہلایا اور اس طرح جسم میں کچھ حرارت پیدا ہوئی۔

سب سے پہلے میں نے خورد و نوش کا تھیلہ برابر والی شاخ سے باندھ دیا۔ کمبل جو ایک ڈوری کے ذریعے کندھے پر بندھا تھا۔ کھول کر دو شاخوں پر ڈال دیا۔ انکے ہر دو سرے ایک ڈوری کے ذریعے شاخوں کے نیچے کی جانب سے اس طرح سے مضبوط باندھ دیئے کہ ایک جھولا سا بن گیا۔ بلاشبہ وہ ایک آرام دہ بستر تھا۔ اس کام سے فارغ ہوکر میں نے ضروری کپڑوں کے سوا تمام کپڑے اتار کر ان کا تکیہ بنا لیا۔ لیجئے میرا بستر تیار تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے خدا کا نام لے کر اپنے اس جھولے میں قدم رکھا۔ "داؤ" کو اپنی بائیں جانب رکھ کر لیٹ گیا۔ ایک نظر نیچے دیکھا تو معلوم ہوا کہ درندوں کا قافلہ اپنی پرانی جگہ واپس جا چکا تھا۔

میں سوچتا رہا کہ آیا مجھے رات جاگ کر گزارنی چاہیئے یا سو کر۔ اگر شب کے کسی حصے میں یہ قافلہ کوچ کر جائے تو مجھے بھی فوراً یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیئے۔ کافی دیر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آرام سے سونا چاہیئے۔ کل صبح جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

اس فیصلے کے بعد میں نے لیٹے ہی لیٹے ڈبل روٹی کے کچھ نوالے کھائے اور بوتل سے پانی پیا اس کے بعد خطرے کے باوجود مجھے نیند آگئی۔ قسمت میرے اس اطمینان پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔

نہ معلوم کتنی دیر گزری تھی کہ ایک تیز نوکیلی چیز میری گردن میں گھسنے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا ہاتھ فوراً گردن پر پڑا۔ ایک بڑا چیونٹا میری گردن سے چمٹا ہوا تھا۔ میں نے مسل کر اسے گردن سے الگ کیا۔ ابھی اس کے کاٹنے کی جلن محسوس کر رہا تھا کہ داہنے بازو میں سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں وہاں بھی یہی حضرت تھے میں اٹھ بیٹھا۔ اپنے اردگرد کمبل پر ہاتھ پھیرا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک دو نہیں بلکہ پوری قطار ہے جو حملہ آور ہوئی ہے۔ گھبراہٹ کے مارے میں نے کمبل کو چھوڑ کر شاخوں کا سہارا لیا۔ یہ کوئی معمولی مصیبت نہ تھی۔ خوف سے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ کیوں کہ یہ چیونٹے مردہ جانوروں کے جسم چند منٹ کے اندر اندر چٹ کر جاتے ہیں۔ عین اسی وقت شیروں کے گرجنے سے جنگل کانپ اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ شیر درخت کی طرف اچھلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا تھا، شیروں کی گرج، رات کی بھیانک تاریکی اور آدم خور چیونٹیوں کے پے درپے حملے مجھے موت کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔

میں بوکھلاہٹ میں اپنے اردگرد کی دوسری شاخیں ٹٹولنے لگا۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی پتوں سے چھن چھن کر شاخوں پر پڑ رہی تھی۔ فضا میں حبس تھا، شیروں کا قافلہ اپنی جگہ موجود تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آدھ گرج سنائی دے جاتی۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں شاخ بدل دوں۔ کمبل کو کھونا ناممکن تھا۔ میں نے اسی حالت میں دوسری شاخ کو اپنا آشیانہ بنایا، سونا تو کجا پلک جھپکنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

شاید نصف گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ پیر کے بائیں پنجے پر پھر اسی جلن کا احساس ہوا ساتھ ہی بایاں ہاتھ جس سے میں تنے کا سہارا لئے ہوئے تھا، اس میں شدت کی ٹیس اٹھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے ان چیونٹوں کو الگ کیا۔ شاخ پر ہاتھ رکھا، تو معلوم ہوا کہ ان آدم خوروں کی قطار یہاں بھی پہنچ چکی ہے۔ اُف خدایا! انہوں نے میرا پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا۔ میں گھبراہٹ کے عالم میں اوپر کی دوسری شاخوں کی طرف بھاگا۔ اور درخت کی سب سے اونچی شاخ پر پہنچ کر دم لیا۔ شاید یہاں میں ان سے محفوظ رہ سکوں۔ میرے ہاتھوں اور پیروں میں بے پناہ جلن اور کھجلی ہو رہی تھی۔ سوزش سے جسم پھنکا جا رہا تھا۔ کم بختوں نے جہاں جہاں کاٹا تھا وہ جگہیں سوجتی جا رہی تھیں۔ جب کافی دیر گزر گئی تو اطمینان ہوا کہ اب اس آفت ناگہانی سے نجات مل گئی۔

فضا میں ہلکی ہلکی خنکی پیدا ہو چکی تھی جو اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ شب میں چوتھائی کے قریب گزر چکی ہے۔ یہ بات مزید تقویت کا باعث تھی۔ کم ازکم دن کی روشنی خطروں سے خبردار کرنے میں تو معاون ثابت

ہوگی یہی سوچتے سوچتے وقت کی نبضیں گنتا رہا۔

اب صبح کی ہلکی سپیدی افق کے کناروں سے اُبھرنے لگی۔ میں نے خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس جان لیوا پرخطر اور اذیت ناک شب کا خاتمہ ہوا۔ میں احتیاط سے دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ بستر تک پہنچا چیونٹوں کا نام و نشان نہ تھا۔ قافلے کی طرف نظر ڈالی تو وہ اپنی جگہ موجود تھا۔

بھوک بڑھتی جا رہی تھی، تھیلا کھولا، نظر پڑتے ہی وہ ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ خدا کی پناہ! تھیلا ان چیونٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

یہ خیال کہ اب کھانے پینے کے قسم کی کوئی شے میرے پاس نہیں، بڑا ہی جان لیوا تھا، سخت روح فرسا۔ اُف خدایا۔ کیا یہ میری زندگی کے آخری لمحات ہیں۔ میں اپنی اس موت کے تصور سے جو بے بسی اور بے چارگی کے درمیان ہونے والی تھی کانپ اٹھا۔

اب سوائے اپنے کو خدا کے حوالے کرنے کے اور کوئی شکل نہ تھی۔ اب کوئی معجزہ ہی مجھے اس صورت حال سے بچا سکتا تھا۔ میں کچھ دیر سر جھکائے خدا کے حضور اپنی نجات کے لئے دعا کرتا رہا۔ اچانک مجھے درخت کے نچلے حصّے سے سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا۔ آہ! یہ کیا؟ ایک پانچ فٹ لمبا اژدھا اپنا بھیانک منہ کھولے درخت کے تنے سے لپٹ رہا تھا۔ گویا موت بہت قریب آتی جا رہی تھی۔ اب سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ یہ کچھ کر گزرنے کا وقت تھا۔ میں نے جلدی سے داؤ اٹھایا اور اس شاخ پر بیٹھ گیا جو تنے میں سب سے پہلے نکلی ہوئی تھی، اژدہا کافی موٹا تھا وہ تنے کے سہارے اوپر سرکتا جا رہا تھا۔ اس کی لمبی زبان جلد جلد اندر باہر ہو رہی تھی۔

میں نے تنے کے گرد باہیں ڈال کر ہاتھ کو مضبوطی سے لپیٹ لیا اور داہنے ہاتھ میں داؤ پکڑ کر حملہ کرنے کی حالت میں بیٹھ گیا۔ ابھی اژدہا تقریباً تین فٹ نیچے تھا۔ وہ ایک ایک انچ اُوپر چڑھ رہا تھا میں اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا اور دل ہی دل میں اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتا رہا۔ ادھر مجھے شیروں کی موجودگی کا احساس پریشان کئے دے رہا تھا۔ میری پیشانی پسینے سے شرابور تھی۔ زندگی کا چراغ بجھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر میں اژدھے کو مارنے میں ناکام رہا تو پھر۔ اس کے بعد میں کچھ نہ سوچ سکا۔ میں نے اس کش مکش سے ابھرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی قوتوں کو جمع کیا

اب اس کا سر میرے "داؤ" کی زد میں تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت سے وار کیا۔ اژدہے کا سر ایک ہی بھرپور وار میں اس کے جسم سے جدا ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بلاشبہ میں موت کے منہ

سے بچا تھا۔ یقین مانیے اس قدر خوشی مجھے کبھی نہ تو قیمتی پتھر فروخت کرنے سے حاصل ہو سکی اور نہ ہی جانوروں کے نوزائیدہ بچے فروخت کرنے پر۔

اب پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔ اس وقت دن کے تقریباً نو بج رہے ہوں گے۔ وہ گرمیوں کے دن تھے۔ میں نے گزشتہ شب سے ایک گھونٹ بھی پانی نہ پیا تھا۔ لیکن پانی ملتا کہاں سے؟ میری نظر نیچے گری ہوئی بندوق پر جم گئی۔ اور تیزی سے ایک خیال ذہن میں کوند گیا۔ اگر میں یہ بندوق کسی طرح حاصل کر سکوں، تو جان بچانے کے کچھ اور مواقع مل سکتے ہیں۔ میں تیزی سے کمبل تک پہنچا۔ اس سے بندھی ہوئی ڈوری کو کھولا، اس کے ایک سرے پر پھندا بنا لیا اور اسے لے کر نچلی شاخ کی طرف آنے لگا تب مجھے خیال — آیا کہ اژدہے کو ختم کرنے کے جوش میں میں اس شاخ تک جا پہنچا تھا جہاں شیر مجھے بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ پھر وہ نزدیک کیوں نہیں آئے؟ میں نے محسوس کیا بہت دیر سے ان کی آواز بھی مجھے سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی میری نظریں اس قافلے کی طرف اٹھ گئیں۔ مگر وہ چٹان تو صاف پڑی تھی، اف، مت پوچھیے کس قدر خوشی محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یقین نہ آیا۔ مگر یہ حقیقت تھی۔ چٹان پر کوئی درندہ موجود نہ تھا۔

میں نے کمبل کی بھی کوئی پروا نہ کی اور نہ یہ سوچا کہ وہ اردگرد کی جھاڑیوں کے پیچھے یا ترائی کی جانب ہو سکتے ہیں جہاں مزید خطرہ پیش آ سکتا ہے، میں ہر چیز کو بھلا کر تیزی کے ساتھ درخت سے نیچے اترا سب سے پہلا کام جو میں نے درخت سے نیچے اترتے ہی کیا وہ بندوق پر قبضہ کرنا تھا۔ پھر میں تھیلے کی جانب متوجہ ہوا جس سے چیونٹے نکل کر اژدہے کے مردہ جسم سے چمٹے ہوئے تھے۔ میں نے تھیلا اٹھایا پانی کی بوتل سلامت تھی اسے کھول کر جلد جلد پانی کے گھونٹ پیے، تو کچھ جان میں جان آئی حواس درست ہوئے تو کارتوس چننا شروع کیے جو تھیلے کے گرنے سے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ ان کاموں سے فارغ ہوتے ہی میں تیزی کے ساتھ اسی راستے پر چل دیا جدھر سے آیا تھا۔ میں نے چشمے کے کنارے پہنچ کر تربوز نما ایک جنگلی پھل کو توڑ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی، اور سستانے کے لیے لیٹ گیا۔ لیٹے ہوئے کچھ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے اپنے سے چند گز کے فاصلے پر پہاڑی بکرے کو جھپٹتے ہوئے دیکھا میں نے اپنی پرانی بندوق اٹھائی اور خدا کا نام لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس کے بھیجے میں لگی اور وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ غصے میں میری طرف دوڑا۔ لیکن چند قدم بڑھ کر دھڑام سے نیچے گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا میری ناکارہ بندوق آج کام آ گئی تھی۔

●●

آج سے کوئی پچاس برس ہوئے دہلی میں ایک بزرگ جاڑے گرمی پنکھا ہاتھ میں لئے پھرا کرتے تھے۔ قاضی کے حوض سے سرکی والوں، لال کنوئیں تک بازار میں پنڈت کے کوچے، نیاریوں، شاہ گنج اور شاہ تارا کی گلی کے اندر اندر انھیں چکر لگاتے دیکھا۔ یوں سننے کو ہزاروں باتیں سنیں، ایک ہی دن میں کسی نے کہا ہمنے قطب کی لاٹھ کے نیچے دیکھا ہے تو کسی نے بیان کیا کہ ہم ابھی روشن چراغ دہلی میں چھوڑ آرہے ہیں۔ بلکہ اجمیر سے آنے والوں نے اجمیر میں اور کلکتہ سے آنے والوں نے کلکتہ میں بھی دیکھا، مگر ہم نے تو سارے دن، دوپہر، شام انھیں گلیوں اور انھیں بازوں میں پنکھا ہلاتے اور پھرتے دیکھا۔

لوگ انھیں مجذوب کہتے ہوں گے۔ اللہ ہی جانے۔ مگر ہم نے تو کبھی ان کی ایسی حالت نہیں دیکھی جیسی عام طور پر مجذوبوں کی ہوتی ہے۔ ہمیشہ کپڑا پہنے ہوئے، لٹھے کا انگرکھا۔ بغیر کرتے کے جس میں سے چھاتی کے بال نظر آتے۔ ایک برکا پاجامہ۔ اجلا بے داغ۔ اور پاؤں میں گول پنجے کی جوتی۔ البتہ سر سے ننگے۔ ٹوپی پہنے کبھی نہیں دیکھا۔ ہمارا لڑکپن تھا اور ان کا بڑھاپا۔ اس وقت وہ کم از کم ستر برس کے پیٹے میں ہوں گے۔ ہاڑ کے معمولی تھے۔ دبلے پتلے، بال کھچڑی۔ چاول زیادہ دال کم۔ رنگ گندمی تھا۔ کسی قدر میلا۔ صورت نورانی۔ چھوٹی سی داڑھی۔ لبیں کتری

ہوئیں۔ چہرے پر متانت۔ نہ بڑبڑانا نہ کسی سے کچھ بات کرنا۔ کوئی سلام کرتا تو پنکھا ہلا دیتے اور گزر جاتے۔ نہ لڑکوں کا غول ان کے پیچھے رہتا اور نہ کوئی ان سے بات چیت کرتا۔

دیوانہ کو دیوانہ بنا دینے کے بھی اسباب ہوا کرتے ہیں۔ ممکن ہے مجذوب پرست انھیں چھیڑ چھیڑ کر پاگل بنا دیتے اور یہ بھی پتھر مارنے اور گالیاں بکنے لگتے لیکن چونکہ ان کے بھتیجے محمد نذیر تھانیدار تھے۔ اپنے وقت کے بڑے مشہور تھانیدار اور اسی علاقے میں قاضی کے حوض کے تھانے پر ان کی تعیناتی تھی۔ اس لئے کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا جو انھیں ستاتا یا ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا۔

ہم نے محمد نذیر تھانیدار کو بھی دیکھا ہے۔ اگرچہ ہمارے ہوش میں انہوں نے پنشن لے لی تھی۔ لیکن رعب داب ان کا دستور تھا۔ سرکی والوں کے بازار میں لال دروازے کے سامنے ایک کوچہ ہے جس کو نور اللہ بیگ کا کوچہ کہتے ہیں۔ اس کوچہ میں ان کا مکان تھا۔ شام کے وقت جاڑے گرمی کوچہ کے آگے پٹری پر کئی مونڈھے بچھ جاتے۔ ایک مونڈھے پر تھانیدار صاحب بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے اور دوسرے پر مرزا وزیر بیگ۔ وزیر بیگ بڑے ہاڑ کے آدمی تھے۔ ٹیسر کا سا چوڑا چکلا چہرہ۔ مہندی سے رنگی ہوئی گول داڑھی کے ساتھ لال آواز ایسی جیسے بادل گرجا۔ محمد نذیر تھانیدار بھی مہندی لگاتے تھے۔ مگر مرزا کے مقابلے میں ان کا جثہ بہت حقیر تھا۔ اس لئے یاروں نے ان پر پھبتی اڑائی تھی کہ لال مرغے ہیں۔ ایک اصیل ایک ٹینی۔ بہرحال ان دونوں کا گٹھ جوڑ تھا۔ جب تک یہ دونوں زندہ رہے کوچہ کے آگے کی بیٹھک نہیں چھوٹی اور کبھی دونوں میں سے ایک کو اکیلا نہیں دیکھا۔ تھانیدار صاحب کے چچا جس وقت اپنے گشت میں ادھر سے گزرتے تو دو چار منٹ کے لئے ایک مونڈھے پر بیٹھتے اور خاموش بیٹھے رہتے اتنی دیر تک یہ دونوں بھی کوئی بات نہ کرتے۔ نیچی نگاہیں کئے مؤدب انھیں دیکھا کرتے تھے اور بازار کے ٹیسر جب انکے آگے گردنیں جھکا لیتے تو لومڑیاں کیا ان کے گرد ہوتیں۔ دوسرے ان کی نہ صورت ایسی تھی کہ لوگ ہنستے۔ نہ کوئی حرکت ایسی

کہ لڑکے بلے چھیڑیں۔ اب رہے درویشوں کے پرستار یا مجذوبوں کے متوالے وہ اکیلے دُکیلے ضرور ان سے عرض معروض کرتے ہوں گے ہم نے اس کے متعلق کچھ سنا نہیں۔ درحقیقت درویشوں کی شہرت انکے شوریدہ مزاج ہی سے ہوتی ہے۔ یہ خاموش تھے۔ اس لئے علانیہ نہ ان کا پہونچے ہوئے فقیروں میں شمار تھا نہ مجذوبوں میں۔

ہم نے ان کا نام معلوم کرنا چاہا۔ افسوس جس سے معلوم کرنا چاہا اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ اور یہی کہا کہ محمد نذیر تھانیدار کے چچا ہیں۔ پھر ہم نے بعض اپنے بڑوں سے پوچھا کہ ان کی یہ کیفیت کب سے ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ یہی کہ ہم نے جب سے دیکھا اسی حالت میں دیکھا۔

لڑکپن کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ جس بات کا پتہ نہیں لگتا اس کی کرید ہو جاتی ہے۔ ایک دن میں اپنے مکان کی ڈیوڑھی پر نانا کے ساتھ کھڑا تھا کہ سامنے سے حضرت پنکھا ہلاتے ہوئے گزرے میں نے نانا سے بھی ان کے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔ اتنے میں کریم اللہ خاں آ گئے۔ یہ شیدی گوہر کے پوتے تھے۔ محلہ میں سب سے بڑی عمر کے آدمی۔ ہمارے مکان کے سامنے ان کا گھر تھا۔ پوچھنے لگے۔ "کیوں بھئی نانا سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" نانا نے کہا۔ محمد نذیر کے چچا کو پوچھتا ہے کہ کب یہ دیوانے ہوئے۔" کہنے لگے آؤ بیٹا ہم بتائیں۔ ہم نے انکا بچپن بھی دیکھا ہے۔ بلکہ مسجد میں ہم دونوں کئی مہینے تک ساتھ پڑھے ہیں یہ بڑے شریر تھے۔ ملاجی ان کی بہت ٹھکائی کیا کرتے تھے مگر ذہن اتنا اچھا تھا کہ چھ مہینے میں قرآن حفظ کر لیا۔"

اس دن معلوم ہوا کہ واقعی حافظ ہیں۔ لوگ یونہی نہیں کہتے۔ میں نے پوچھا اچھا پھر ان کا دماغ کس طرح الٹا؟ انہوں نے بتایا کہ یہ سامنے جو سیّد کا تھان ہے جمعرات کی جمعرات۔ اب تو اتنے نہیں پہلے بہت چڑھاوا چڑھا کرتا تھا۔ بیسیوں چراغ جلتے۔ کبھی کبھی کوئی قوال یا منا جاتی آ بیٹھتا۔

یہاں میں چاہتا ہوں کہ سید کے تھان کی جگہ بھی آپ کو بتا دوں۔ جہاں اب پیر جی عبدالصمد مرحوم کا مکان ہے۔ یہاں کچھ کچے مکان اور کچھ کھنڈر تھے۔

اسی اننگ میں شاہ گنج کی طرف چلو تو ان کچے ڈھابوں کے برابر سفید گھوڑے والے میر صاحب کا اصطبل تھا۔ اصطبل کے آگے میدان۔ لڑکے کبڈّی۔ گلی ڈنڈا۔ گیند چڈی اور گیڑیاں کھیلا کرتے تھے۔ میدان کے خاتمے پر کسی پرانی عمارت کی ایک محراب سی باقی تھی۔ اور اس میں ایک طاق بنا ہوا تھا۔ اسی طاق پر کسی سید صاحب کا گزر سمجھنا چاہیئے۔ وہیں سہرے ٹنکارے جاتے۔ کھیلیں، بتاشے ریوڑیاں وغیرہ چڑھائی جاتیں۔ گھی کے چراغ جلتے۔ جمعرات کو یہ بہار ہم نے بھی دیکھی ہے۔ جھاڑو دلی چھڑکاؤ ہوتا۔ اور شام سے رات گئے تک بیسیوں عورتیں اور مرد چڑھاوا چڑھانے آتے۔ نوچندی جمعرات کو ڈھولک بھی بجتی۔ کسی کسی کے سر پر کبھی کبھی سید صاحب بھی آجاتے۔ ہمیں ممانعت تھی کہ جمعرات کو ادھر ہر گز نہ جانا۔ ہم بھی کچھ ڈرتے۔ اور اس لئے کہ گھر والوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو خفا ہوں گے۔ اس طرف نہ جاتے۔ دور ہی دور سے تماشا دیکھا اور گانا سنا کرتے۔
اچھا تو کریم اللہ خاں نے سنایا۔ "مشہور تھا کہ تھان والے سید کوئی بڑے جلالی ہیں جب بگڑتے ہیں تو بچے بوڑھے عورت مرد کسی کو نہیں دیکھتے۔ کئی قصّے بھی کہے جاتے تھے کہ جمعرات کو طاق میں فلاں شخص کو اس صورت میں نظر آئے تو فلاں کو اس روپ میں۔ کیا مقدور ان کے نام کے چڑھاوے کو کوئی ہاتھ تو لگا لے۔ تخولی پہلوان نے منا کرتے کرتے جلیبیوں کا دونا اٹھا لیا تھا۔ ایسا پٹخنا دیا کہ خون تھوکتے تھوکتے آخر مرگیا۔ دھنّو دھنّو ایک نٹنی تھی۔ بڑی شہدن خلیفہ کلّن نے اس کو ڈال لیا تھا۔ کسی نے کھیر کا پیالہ چڑھایا۔ اس کی رال ٹپک پڑی۔ ہاتھ ڈالتے ہی لوٹن کبوتر بن گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایسی ایسی کہانیاں سنا کر بچوں کو وہاں جانے سے روکتے تھے۔ لیکن بچے کیا مانتے۔ ریوڑیوں اور میٹھی کھیلوں کے لالچ میں آس پاس لگے ہی رہتے۔ کیوں کہ بعض لوگ چڑھاوا چڑھانے کے بعد تھوڑی تھوڑی مٹھائی بچا کر بچوں کو بھی بانٹ دیتے۔ ملّاجی نے ہم کو منا کر رکھا تھا اور چوں کہ مسجد سامنے ہی تھی ان کے ڈر سے کوئی لڑکا نہ جاتا۔ جاتا بھی تو آنکھ بچا کر۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ملّاجی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ نوچندی

دلوائی۔ تعویذ دیئے۔ نقش لکھے۔ کسی نے ڈور دیجائے سارے کرتوت کئے مگر حافظ جی نے آنکھ نہ کھولی ۔ چار دن کے بعد آنکھ کھلی تو نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سرسے کھیلتے ہیں۔ بالکل گم سم نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی پرواہ۔ لیٹے ہیں تو لیٹے ہیں۔ کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں۔ کچھ پوچھو تو جواب نہیں۔

اس زمانے میں کبھی کبھی گھڑ چڑھے فقیر آیا کرتے تھے۔ اس اثنا میں وہ بھی آگئے۔ گھڑ چڑھے فقیروں کی جو صدا حافظ جی کے گھر والوں کو پہونچی تو حافظ جی کو پکڑ کر ان کے سامنے لائے۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا "مائی یہ تو میراں کے جھپیٹ میں آگیا ہے۔ پیران کلیر والے کے ہاں لے جاؤ نہیں تو پاگل ہو جائیگا۔"

حافظ جی کے گھر والوں میں کوئی مرد نہیں تھا۔ دکھڑا پیٹنے والی عورتیں تھیں۔ ماں بےچاری سے جس طرح بھی بنا ماتا کی ماری پیران کلیر لے گئی۔ طبیعت میں ایک قسم کی وحشت جو چلی آتی تھی وہ تو جاتی رہی۔ لیکن آدمی کی جون میں نہ آئے پھر ایک مرتبہ سنا کہ مدار کی چھڑیوں والوں کے ساتھ اجمیر شریف کی طرف نکل گئے لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیٹھ رہے۔ عورتوں نے بھی ان کو صبر کرلیا۔ کوئی گیارہ برس کے بعد خود بخود آگئے۔ لیکن آنا نہ آنا یکساں تھا۔ نہ گھر کے کام کے تھے نہ باہر کے چپ یہاں کھڑے ہیں وہاں بیٹھے ہیں۔ کھانا کھلا دیا کھا لیا۔ پانی پلا دیا پی لیا ورنہ کچھ نہیں۔ کپڑے میلے ہیں تو بلا سے، پھٹ گئے ہیں پھٹ جائیں۔ نہ نہانا نہ دھونا، نہ دھوبی نہ نائی۔

اتنے میں محمد نذیر سپاہیوں میں نوکر ہو گئے تھے ان کے آتے ہی یکایک حوالدار ہو گئے ان کی کرامت سمجھی گئی۔ انہوں نے انکا خیال رکھنا شروع کیا۔ جمعہ کے جمعہ انکا خط بنواتے، نہلواتے کپڑے پہناتے۔ چنانچہ اس وقت سے ان کی یہی کیفیت ہے۔ دیوانے تو البتہ نہیں ہیں۔ لیکن دن رات پنکھا ہلنے پھرنے سے کام ہے۔ اللہ ہی جانے کس خیال میں مست رہتے ہیں اور مجذوبوں یا فقیروں میں ان کا کیا درجہ ہے ہم تو بھئی ایسی باتوں کے قائل نہیں۔ کریم اللہ خاں کی زبان سے یہ سن کر کہ ہم تو ان باتوں کے قائل نہیں۔

مجھ کو بڑا تعجب ہوا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں ظاہری حکومت کے ساتھ باطنی حکومت کی بڑی دھوم تھی۔ ہر انوکھا فقیر اور مجذوب خدائی فوجدار سمجھا جاتا تھا۔ علاقے بٹے ہوئے تھے۔ فلاں صاحب دلی دروازے سے جامع مسجد تک کے قطب ہیں تو فلاں بزرگ کی علمداری کشمیری دروازے سے لاہوری دروازے تک ہے۔ حافظ جی کو بھی بعض لوگ اپنے علاقے کا حاکم سمجھتے۔

مختصر یہ کہ حافظ جی کے متعلق کوئی خاص کرامت تو منسوب نہ تھی تاہم ان کی قطبیت میں بھی شبہ نہ تھا۔ مجھے ان سے ایک قسم کی دلچسپی ہوگئی تھی اکثر انکے ساتھ ساتھ دور تک چلا جاتا۔ شوق تھا کہ کبھی ان کی آواز سنوں۔ مہینوں گزر گئے کبھی کبھی ہونٹ ہلتے ہوئے تو ضرور دیکھا لیکن آواز سننے میں نہیں آئی۔ ایک روز ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور ٹھیٹھ گرمی کا موسم۔ خدا معلوم کیوں میں ڈیوڑھی کے باہر آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی دیکھتا کیا ہوں کہ حافظ جی غیر معمولی تیز قدمی کے ساتھ جا رہے ہیں پنکھا بھی زور زور سے ہل رہا ہے۔ تیور بدلے ہوئے۔ آپ ہی آپ کچھ بول بھی رہے تھے۔ میں پیچھے پیچھے ہو لیا کہ سنوں کیا کہتے ہیں۔ چند قدم کے بعد صاف آواز آنے لگی۔ ایسی جیسے کوئی وعظ کہتا ہے۔ انکے الفاظ تو کیا یاد رہتے یہ بھی ان کی کرامت سمجھو کہ مفہوم آج تک مجھ کو یاد ہے۔ اس وقت تو میں کچھ سمجھا نہیں لیکن آج جب ان کی بڑ کا خیال آتا ہے تو انکے صاحب نسبت ہونے میں شک نہیں رہتا۔ واقعی خاموش اللہ والے تھے۔ ان کی بڑ کا مفہوم میں اپنے لفظوں میں آپ کو سناتا ہوں۔ سمجھ لیجئے اللہ والوں میں انکا کیا درجہ ہوگا۔

"دور ہو دور، او دنیائے دلفریب دور دور! تونے مکار دھوکے باز مجھے کن مصیبتوں میں پھنسا دیا ہے۔ میں مختار نہیں بندۂ مجبور ہوں۔ اپنی خوشی ایک لمحہ یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ کیا مقدور اپنے ارادے سے سانس لے سکوں ہر وقت چشم براہ اور ہر لحظہ گوش بر آواز ہوں۔ آقا کے حکم کا انتظار ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت میری طلبی کا فرمان آجائے، آہ! اس فرمان کے بعد اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ جس طرح بیٹھا ہوں اسی

طرح اٹھ کھڑا ہوں پھر تو ہی انصاف کر کہ یہ آخری لمحہ میرے لئے کس قدر دشوار ہوجائے گا اگر میں ابھی سے اپنے آپ کو اس لئے آمادہ نہ کروں اور اس رہ گزار سے آگے بڑھنا میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوگا اگر میں ابھی سے ان کانٹوں کو نہ ہٹاؤں جو خواہشوں نے بچھا رکھے ہیں اور ان پتھروں کو دور نہ کروں جن کی موجودگی میں قدم جنبش نہیں کر سکتے۔

لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں۔ میں دیوانہ ہی سہی۔ کسی نے میرا نام مجذوب رکھا ہے۔ قربان میاں اپنے اندر مجھے جذب کرلیں۔ دنیا مجھ کو گونگا بہرا اپنے حال سے بے خبر سمجھتی ہے۔ لیکن میں گونگا ہوں نہ بہرا نہ اپنے حال سے بے خبر جو اپنے آقا کی آنکھیں دیکھ چکا ہو۔ جس نے اپنے مالک کی پکاریں سنی ہوں کون ہے جو اسے بے خبر کہے۔

دور ہو دور! مجھے اپنی آرائشوں سے معاف کر۔ میں ان بالوں کو کیا سنواروں جن کا رنگ چند روز میں تبدیل ہوجاتا ہے اور جو سودائے اعتدال میں ذرا کمی ہونے سے موت کا پیام دینے لگتے ہیں۔ آہ! میں اس چہرے کو کیا آئینہ میں دیکھوں جس کی نجانے کون سی ادا پیا کو بھاتی ہے جس کی تروتازگی چند دن کی مہمان ہے اور جو تھوڑے دن میں ڈراونی شکل اختیار کرنے والا ہے۔ بتا میرا منہ کیا دیکھتی ہے بتا آخر میں کس امید پر اس پیکر فانی کو لباس فاخرہ سے آراستہ کروں جس کے انتظار میں قبر کے پر شور دروازے بے چین ہو رہے ہیں۔ میں تو جیسا ماں کے پیٹ سے نکلا تھا ویسا ہی پھرتا تجھ کو اور تیری ذریات کو دعوت دیتا کہ آ اور مجھ سے شرما یا مجھ کو شرما۔ لیکن کیا کروں میرے مالک کا حکم نہیں۔

اری چڑیل، چھل پائی، تو مجھے تانے دیتی ہے۔ اضطراب کے طعنے۔ آخر میں ان در و دیوار کے اندر کیوں کر چین سے بیٹھوں۔ جن سے عنقریب جبری طور پر پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے مجھ کو جدا کیا جائے گا۔ اور میں تیرے اس ساز و سامان سے کس طرح دل خوش کروں جبکہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ میرے

ضے سے باہر ہونے والا ہے۔ تیرے میکدے کے متوالوں کی رنگین صحبتیں مجھے
ی غفلت کی ترغیب دے چکی ہیں لیکن میں ان تماشوں سے کیوں آنکھیں بند
ینا جو میرے سامنے ہو رہے ہیں۔ میں کس طرح واقعات کو دل سے بھلادوں
انتا ہوں کہ یہ صحبتیں عنقریب برہم ہو کر رہیں گی۔ وہ زمانہ کچھ دور نہیں کہ محبت
جائی کا شیرازہ ٹوٹ جائے گا۔ تو سنکے گی اور سب روئیں گے۔
غرض میں نے جدھر نظر اٹھائی اور اب بھی جس طرف نظر اٹھاتا ہوں
ری ہر شے میں مکار بیسوا کی دلفریبی پائی اور آج بھی پاتا ہوں لیکن ایک
ی دلفریبی جس کے اندر زوال کا اضطراب اور رفتار کی آسودگی موجیں مارتی
ھائی دیتی ہے اور اس لیے مجھ کو چین نہیں۔ مجھے تو خوشی کی جگہ ملال۔ امن
یش کی جگہ بے قراری و تکلیف کا سامنا رہتا ہے خاموشی کے سوا کوئی چارہ
یں، اندر ہی اندر گھٹ کر دل ہی دل میں حافظ جی کا یہ شعر پڑھنے لگتا ہوں۔

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہردم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

اب میں حافظ جی کو کیا کہوں تجھکو جس میں فریب کے سوا کچھ نہیں منزل جاناں
انتے ہیں۔ منزل جاناں اگر یہی ہے تو ایسی منزل جاناں کو سلام۔ لیکن نہیں منزل
جاناں کو اس سے زیادہ دغابازی کا گھر ہونا چاہیئے۔ عشق و ہوس کا امتحان آخر
طرح ہوتا۔ کیوں پتہ کی سن کر گھبرائی۔ حافظ جیسے خوش مذاق لوگوں نے تجھ کو
منزل جاناں کہہ دیا تو اکڑ گئی۔ لگی ہم کو بھی اپنا نٹھی پن دکھانے۔ اپنی آرائش و دلکشی
کے لحاظ سے تو منزل جاناں سہی۔ ہم بھی حافظ کی لے میں لے ملا کر کہتے ہیں کہ تو
نزل جاناں، منزل جاناں، منزل جاناں، لیکن منزل جاناں کہنے کے بعد یہ بھی
یکھا کہ حافظ جی نے آنکھیں کس طرح نیچی کرلیں، سر کیا جھکا لیا۔ انھیں فوراً
یاد آگیا کہ ایک بے قرار راہرو کو اس منزل میں امن و سکون اور راحت و آسودگی
کے کیا معنی جہاں ہر لحظہ فریاد جرس بلند ہو رہی ہے کہ اٹھو، اسباب سنبھال
و۔ کمر باندھو۔ سفر کی تیاری کرو۔ یہ جرس ہے؟ نفس کی آمد و شد جو ہر دم عمر کی

کمی اور موت کے قرب کا پتہ دے رہی ہے۔ ؎

اے غافلو دم آرہ نمط آئے جائے ہے
سوچو کہ نخلِ عمر کو یہ کھائے جائے ہے

پھر ا پھر کیا ایک "عابر سبیل اور ایک عامل کُن فی الدنیا کانک غریب" کو راستے کی روح افزائیوں اور دلکشائیوں سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے جب تک وہ اپنے اصلی وطن کی سرزمین پر قدم نہ رکھے جہاں پھول مرجھانا نہیں جانتے اور جہاں خزاں کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ نہ زمین بدلتی ہیں نہ اندھیرے اجالے سے واسطہ رہتا ہے۔

اتنا کہنے کے بعد حافظ جی نے یکایک پلٹ کر دیکھا اور پنکھا زور زور سے ہلانے لگے۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک عجیب جلال تھا۔ میں ڈر کر بھاگا اور گھر میں آکر دم لیا۔ اس کے بعد کوئی ایک ہفتے تک وہ بالکل نظر نہ آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ پردہ کر گئے۔ ایک دن خلاف معمول شام کے وقت گھر میں گئے وضو کیا نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ اللہ اکبر کہتے ہی سجدے میں گر پڑے۔ عورتیں دیکھنے کو دوڑیں تو ختم تھے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

اردو کہانی

جمیلہ ہاشمی
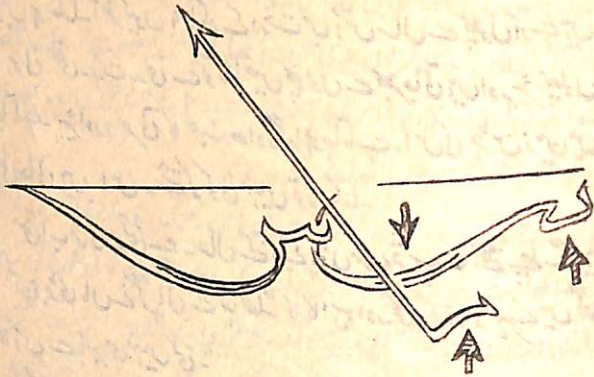
پرندے تیز تیز پر مارتے اُڑتے جاتے ہیں اور دھوپ پیلی ہو کر اچھل کے بڑے تالاب کی سیڑھیوں پر اتر آئی ہے۔ گوردوارے کے کلس کا رنگ ڈوبتی کرنوں میں سنہری مائل سفید لگ رہا ہے، اور بڑے میدان سے دوسری طرف میلہ بکھرنے لگا ہے۔ اب تھوڑی دیر میں دسہروں کو آگ لگا دی جائے گی۔ لوگ شور کریں گے، ڈر کر دور بھاگیں گے۔ اور شام کے نیلے دھندلکے میں چنگاریاں اترتی ہوئی پھلجھڑیاں لگیں گی۔ دیر تک آگ کے شعلے اُٹھیں گے۔ اِردگرد کے لوگوں کے چہرے اس آگ کی روشنی میں بڑے بھیانک لگیں گے۔ جیسے ان میں سے ہر ایک راون کا روپ دھارے سیتا کو جدائی سے دلاپ کرتے دیکھنے اور —— بن باس بھوگتے پا کر خوش ہونے یہاں آیا ہو۔

بن باس کتنی کٹھن بات ہے۔ پر کسی کے بس میں تو کچھ نہیں۔ کون اپنی خوشی سے دُکھ قبول کرتا ہے۔

بھائی کہا کرتے تھے "بی بی تم یہ سارا وقت خواب سے کیوں دیکھتی ہو۔ یہ پیار جو تمھیں اب ملتا ہے، یہ رونق جو تمھارے گرد نظر آ رہی ہے ہولے ہولے کم ہو جائے گی۔ وقت ہر شے میں کمی کر دیتا ہے، پر یہ بربادی اتنی آہستہ ہوتی ہے کہ ہم اس کے عادی ہو جاتے ہیں"۔ آج بھائی کہاں ہیں۔ اگر جنم بھومی کی باس کو اُٹھائے جاسوس کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلنے والی ہوا جا سکتی، اور انھیں کہیں ڈھونڈھ

سکتی تو میں کہتی۔" جا کر پوچھو تو سہی۔ یہ دکھ میں کمی کیوں نہیں ہوتی، برسوں بوجھ اُٹھائے اور کٹھن راہوں سے گزرنے پر بھی انسان سپنے کیوں دیکھتا ہے، سُکھ کی آس کیوں کرتا ہے، روشنی سے اتنا پیار کیوں کرتا ہے؟"

سیتا جی نے بن باس بھوگ کر بس یہی دعا کی تھی کہ وہ رام چندر سے مل سکیں۔ کیا مصیبت انسان کو اتنا سخت نہیں کر دیتی کہ وہ اچھے دنوں کی امید ہی چھوڑ دے۔ اندھیرے سے آخر پیار کیوں نہیں ہو سکتا۔ آخر کیوں؟ ناکھ کے درخت میں اُس سال سے پھول آرہے ہیں، جس سال منّی پیدا ہوئی تھی۔ رُت بدلتی ہے تو شاخیں پھولوں سے بھر جاتی ہیں اور پیڑ پھلوں کے بوجھ سے جُھک جاتا ہے۔ پیڑ اور دھرتی کا سمبندھ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اُس کی جڑیں زمین میں اور گہری گڑتی چلی جاتی ہیں۔ اس رشتے کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔

مُنّی اب بڑی ہو گئی ہے۔ سال کتنے دبے پاؤں میرے قریب سے نکلتے چلے گئے ہیں۔

آج بڑی ماں نے گوپال سے کہا تھا۔" کاکا، بہو اور بچّوں کو ذرا دسہرے میں گھما لا۔ کتنے برس سے وہ گاؤں سے باہر ہی نہیں گئی۔"

گوپال نے بہت تیزی سے کہا تھا۔" ماں تو نے یہ کہا کب تھا۔ یہ برسوں سے کہیں نہیں گئی تو میرا کیا دوش ہے بھلا اس میں؟" بھلا اِس میں کس کا دوش ہو سکتا ہے۔ جب کوئی مجھے بہو کہتا تو لگتا ہے گالی دے رہا ہو۔ برسوں سے سُن رہی ہوں، اس رات سے سُنتی آئی ہوں۔ جب گوپال نے مجھے اس آنگن میں ڈھکیلا تھا اور چوکی میں بیٹھی ہوئی بڑی ماں سے کہا تھا۔

"ماں، دیکھ تیرے لئے بہو لایا ہوں۔ بانکی اور سُندر۔ آج جتنی لڑکیاں ہمارے ہاتھ لگیں اُن میں یہ سب سے اچھی ہے۔" اور دیئے کی لو کو اونچا کر کے ماں میری طرف آئی تھی۔ بھوک اور خوف سے میری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میلوں ننگے پاؤں چل کر مجھ میں انگلی اُٹھانے کی سکت بھی نہ رہی تھی۔ میں ان کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی تھی۔ آنگن میں بندھی گائے اور بھینس ٹکر ٹکر مجھے تکتی رہی تھیں اور چارہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ماں نے سر سے پاؤں تک کئی بار مجھے دیکھا تھا اور پھر کہا تھا۔

"تو اگر اچھے کام کرتا تو آج یہ حال نہ ہوتا میرا۔ دیکھ چولھا جھونکتے جھونکتے میری آنکھیں اندھی ہو چلی ہیں اور ساری کہاریوں نے فصل پر اناج نہ ملنے کی وجہ سے ہمارے گھر آنا بند کر دیا ہے۔ بتا مجھ سے یہ گھر کا بوجھ کیسے سنبھلے گا۔ کھیتی باڑی کرے تو کیا ہی سکھ ہو مجھے۔"

گوپال نے کہا۔" دیکھ تو سہی۔ اب مہریوں اور کہاریوں کے نخرے اٹھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ یہ جو تیری داسی ہے، بس اس سے چکی پسوا، پانی بھروا جو مرضی ہو کروا میرا اس کا کیا علاقہ۔

میں نے تجھے بھولا دی ہے۔"

سارے سنگراؤں میں بہوئیں آئیں، نہ کوئی باجہ بجا، نہ کوئی ڈھولک پر لہک لہک کر گیت گائے گئے، نہ ناچنے والیوں نے سوانگ بھرے اور نہ کوٹھے مٹکا کر نقلیں کیں۔

میرے دھول سے اٹے ہوئے بالوں میں نہ کسی نے تیل ڈالا، نہ کسی نائن نے سنگار کیا۔ کورے ہاتھوں اور اُجڑی مانگ سے میں سہاگن بن گئی۔ کسی نے دروازے پر میرے سر سے تیل، ماش نہ وارے اور بڑی ماں نے گرپال کی بات سُن کر یوں میری طرف دیکھا گویا میں مصیبت، ہوں جسے اُس کا پوتا کہیں سے اٹھا لایا ہے۔ پھر دیا اس طرح ہاتھ میں لئے وہ چوکے میں چلی گئی اور مجھ سے کسی نے پوچھا۔ بہو کا کیسا سواگت ہو رہا تھا؟

تب سے آج تک .... ، میں بن باس بھوگ رہی ہوں اور میں سنگراؤں میں قید ہوں۔ جھوٹے اکھاڑنے، بیڑیاں پیتے جھونوں والے ایک دوسرے سے گالی گلوچ کر رہے ہیں اور گدھوں پر سامان اتنے زور سے پٹختے ہیں جیسے گدھے لکڑی کے ہوں۔ رام لیلا کی رتھیں ایک طرف کھڑی ہیں اور روپ دھارنے والے لڑکے چمکیلے کپڑوں کی پروا کئے بنا ملائی کی قلفیاں اور چٹنی والے پکوڑے کھا رہے ہیں۔ دودھ اور چٹنی کے دھبے ان رنگ برنگ پوشاکوں پر کوڑھ کے داغ لگتے ہیں۔ منی کھڑی انجیں تکتی جا رہی ہے۔ اُسے اس بات کا ہوش نہیں کہ وہ گم ہو جائے گی۔ بے ہوش ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ جسے گم ہونا ہو وہ بھرے گھر سے کھو جاتا ہے۔

گرپال اسے کھینچ رہا ہے اور دونوں لڑکے تھک کر رونے ہر بیچنے والے کو دیکھ کر چیز کے لئے ضد کرنے لگتے ہیں۔ یہ میلہ ہے؟

مائیں بچوں سے بے پروا بھیڑ میں دھکے کھا کر ادھر اُدھر ہو جاتی ہیں اور چھوٹے بچے ایک ایک چہرے کو تکتے، زور زور سے روتے، آگے ہی آگے بھاگے جاتے ہیں۔ بھلا میلے میں بچھڑنے والے کہیں پھر ملتے ہیں؟ یہ جوگ جنم جنم کے لئے چاہنے والوں کے درمیان اوٹ بن جاتا ہے۔ وہ صورتیں جن پر ہم سارا کچھ لٹا دیں۔ اس آس پر کہ ہم انھیں ایک بار پھر دیکھ سکیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ راستے لہروں پر تانا بانا بننے والے کیڑوں کے قدموں کے نشانوں کی طرح ہمارے پیچھے مٹ جاتے ہیں۔ ہم جن راہوں سے چل کر آتے ہیں اُن سے لوٹ نہیں سکتے۔ کچھ بھی تو واپس نہیں آتا۔ اور میلے کی بھیڑ آگے ہی آگے چلتی رہتی ہے۔

وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ بھیا کہا کرتے تھے "بی بی جو لمحہ بیت جاتا ہے وہ مٹ جاتا ہے، دھول بن جاتا ہے۔" جب میں پڑھنے میں بے دھیانی سے کام لیتی اور گڑیا گھر کو سجانے میں سکول

سے آگر سہیلیوں کے ساتھ لگی رہتی تو بھیّا۔ مجھے سمجھایا کرتے۔

یہ گڑیا گھر مجھے بابا نے لاکر دیا تھا۔ بابا یہ کھلونا میرے لئے کسی نمائش میں سے خرید کر لائے تھے۔ مُنّی دونوں ہاتھوں سے اپنی بڑی سی کپڑے کی گڑیا سنبھالے ہوئے ہے۔ گڑپال اوپر بھیڑ کو دیکھ رہا ہے اور منّی جھک جھک کر گھڑی گھڑی اپنی گڑیا کو دیکھتی ہے۔ دونوں لڑکے راون کے بُت لئے ہوئے ہر چہرے کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ مُنّی کی آنکھوں میں اپنی گڑیا کے لئے کتنا پیار ہے۔ کپڑے کے چوڑے سے مُنہ پر بے ڈھنگے ٹانکوں سے ناک اور آنکھیں بنی ہیں۔ ناک میں نتھنی ہے۔ گوٹے لگی چنری سر پر رکھے اپنے لہنگے کو سنبھالے یہ کنچنی لگتا ہے، ابھی ناچے گی۔ اچل کے تالاب کے کنارے کنارے ہو کر کھیتوں میں سے ہمارا راستہ سنگراؤں کو جاتا ہے۔ زندگی کا کارواں چلتا ہی رہتا ہے۔ سیدھے ٹیڑھے راستوں اور اُلجھی پگڈنڈیوں سے کسی منزل پر پہونچنے کی تمنا نہ بھی ہو تو بھی سدا چلتے رہنا پڑتا ہے۔ سدا سدا، چاہے پاؤں زخمی ہوں اور دل میں کچھ نہ ہو۔

شام کا نیلا دُھندلکا اور نیچے اُتر آیا ہے۔ شامیں نہ جانے کیوں مجھے بے حد اُداس کر دیتی ہیں۔ آکاش پر اکیلا تارا دھڑکتا کانپتا۔ دیے کی لَو کی طرح تھرتھراتا ہے اور میں نیلاہٹ کے خالی سمندر میں اس تنہا پیڑ کی طرح ہوں، جس پر نہ پھول آتے ہیں نہ پھل۔

یہ تارا مجھے اس جہاز کی یاد دلاتا ہے جس میں بھائی سمندر پار گئے تھے۔ وہ اپنے ڈھیروں سامان کے ساتھ جب دور دیس جانے کو تیار ہو رہے تھے تو اماں کی آوازیں آنسوؤں کی دُھندھن تھی۔ مگر وہ بڑی تسلی سے چیزیں ٹھیک کرتی اور دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ باہر بابا کئی طرح کے انتظامات میں لگے تھے اور بھیّا اُداس تھے۔ آپا چُپ چاپ گم سم آنگن میں دبے پاؤں چلتی اِدھر اُدھر جا رہی تھیں۔ میں سارے گھر میں چہکتی پھرتی تھی۔ چوٹ جب تک نہ لگے زخم کی تکلیف کا کیا پتہ چلتا ہے۔

بندرگاہ تک ہم سب اُنھیں پہنچانے گئے تھے۔ بھیّا بھائی کا سامان، رکھوانے، کاغذ ٹھیک کرنے گینگ دے پر اوپر سے اُدھر آجا رہے تھے اور میں جنگلے پر جھکی مٹیلے سبزی مائل پانی کو دیکھتی بھائی سے پوچھ رہی تھی۔ یہ پانی ایسا کیوں ہے؟ اس پر تیل کے دھبے کیوں ہیں، کشتیاں کیوں ہیں؟ چپو کیوں ہیں، لنگر کیوں ہیں؟ اونچی نیچی لہروں پر کشتیاں ڈولتی ہیں تو ہول نہیں آتا کیا؟ سوالوں سے پریشان ہو کر بھائی کہہ رہے تھے "جب تو بڑی ہو جائے گی تو ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہو جائیں گی بی بی"

اور آج مجھے معلوم ہے جس کشتی کے چپو نہ ہوں وہ ڈوب جاتی ہے۔ کشتیاں ساحل پر بھی ڈوب جاتی ہیں۔ پانی کی ایک لہر بھی انھیں ڈبونے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ بڑے ہونے پر جب باتوں

کا پتہ چلا ہے تو بھائی نہیں ہیں۔

پھر جہاز کی سیٹیاں سنائی دیں اور بابا نے بھائی کو گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر "اچھا بھئی سپرد خدا" کہا تھا۔ بھیا بھائی سے لپٹ گئے تھے۔ آپا بڑے کمزور دل کی بات بات پر رو دینے والی تھی۔ اُسے ہچکیوں سے روتے دیکھ کر بھائی نے کہا تھا "بی بی کو دیکھو کیسی خوش ہے۔ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے، دو سال میں تو میں لوٹ آؤں گا۔ کوئی میں سدا کے لئے بچھڑ رہا ہوں"۔ پھر مجھے سینے سے لگا کر بولے "بی بی میں تیرے لئے پیرس سے تحفے لاؤں گا۔ بس تو مجھے خط لکھتی رہا کرنا" اور میں نے زور سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر جب آخری سیٹی سُنائی دی تو بڑے مطمئن سے، بہت لاپروائی سے قدم اُٹھاتے جیسے کہیں قریب ہی جا رہے ہوں۔ چلے گئے۔ جب تک جہاز نظر آتا رہا ہم رومال ہلاتے رہے۔ پھر شام کے دھندلکوں میں بندرگاہ کی ساری روشنیوں کا عکس پانی میں ڈوبنے لگا۔ اور جہاز کی بتی اکیلے تارے کی طرح کانپتی رہی اور پھر اوجھل ہو گئی۔ اور اس کے بعد ساری روشنیاں میرے گرد سدا کے لئے ڈوب گئیں۔ لہروں میں سے کبھی کوئی کرن نہیں نکلی۔

میں اماں سے لپٹ کر کتنی زور سے چیخ پڑی تھی۔ میرے دل میں کوئی کہہ رہا تھا اب یہ صورت پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔ اب تو بھائی کو کبھی دیکھ نہ سکے گی۔ میرا دل زور زور سے کانپ رہا تھا۔ جیسے مغرب میں خالی آکاش پر اکیلا تارا نیلے دھندلکے سے اوپر تھرتھراتا اور ڈرتا ہے۔

دُور باغوں میں رات کی سیاہی اپنے پر پھیلا رہی ہے۔ گوپال نے دونوں لڑکوں کو کندھوں پر بٹھا لیا ہے اور وہ کھیتوں کے درمیان سفید لکیر کی سی پگڈنڈیوں پر ہم سے آگے آگے جا رہا ہے۔ میں اور منّی دھیرے دھیرے چل رہی ہیں۔ پانی کے نالوں کو پھلانگ کر وہ اُس کھیت پر ہمارا انتظار کرے گا اور دونوں لڑکوں کو راون کی کہانی سُنائے گا۔ اُسے کیا معلوم میں اُس کے پیچھے آ رہی ہوں اور وہ خود راون ہے۔

منّی مجھ سے کہتی ہے "ماں سروپ کے ماما نے اُسے دسہرے پر اچھے رنگ والے کپڑے بھیجے ہیں۔ ریشمی ہیں۔ ہاتھ لگانے سے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ماں میرے ——— کوئی ماما نہیں ہیں۔ جو مجھے اچھی اچھی چیزیں دے سکیں۔ ماں تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ میلہ اچھا نہیں لگا تمھیں۔ تم تھک گئی ہو ماں؟"

"ہاں منّی میں تھک گئی ہوں، میں بوڑھی ہو گئی ہوں، مجھے بہت چلنا پڑا ہے۔"

"کوئی بھی نہیں بوڑھی ہو گئی"۔ منّی بڑے یقین سے میری طرف دیکھ کر کہتی ہے۔ "تم تو دیوی کی مورتی لگتی ہو ماں، بڑی ماں بھی یہی کہتی ہے۔"

منّی کو کیا معلوم مجھے کتنا چلنا پڑا ہے۔ ایک زندگی سے دوسری زندگی کا فاصلہ کتنا بہت ہوتا

ہے اور جب انسان اینٹھ جاتا ہے۔ اُس کے من میں کوئی آشا نہیں رہتی تب وہ پوجنے کے قابل ہو جاتا ہے۔
ستمگراؤں کی راہوں پر بچھڑے ہوؤں کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ میرا من خالی ہے۔
میں لکشمی ہوں پر پھر بھی دُکھ کا ناتا کتنا اٹوٹ ہے۔ گہرا اور پکا کبھی ساتھ نہ چھوڑنے والا۔

منّی پھر پوچھ رہی ہے "ماں کیا میرے ماما نہیں ہیں؟"

میں اُسے کیا کہوں۔ میں اُسے کیا جواب دوں۔ دوراہے پر کھڑی سوچ رہی ہوں۔

بھیا مجھے کتنے پیارے تھے پر میں اُن سے ڈرتی بھی بہت تھی۔ وہ گھر میں گھُستے تو چیزیں خود بخود
سر پر آجاتی۔ چال میں ٹھہراؤ اور ہنسنے کی آواز میں روک کی کوشش ہوتی۔ جب میں ان کے قریب کھڑی
ہوتی تو لگتا دُنیا میں ان سے لمبے قد کا کوئی نہیں ہو سکتا۔ سنبھل کر چلنے اور سلیقے سے بات کرنے والے
میرے بھیا کتنا اچھا لکھتے تھے۔ صاف سیدھی لکیریں۔ نہ صفحے گندے کرتے اور نہ ہاتھوں میں سیاہی
بھرتے۔ مجھے کہتے "بی بی، جب تو بڑی ہو جائے گی تو تو بھی ایسا ہی لکھا کرے گی"۔ سیدھی سطریں اور بنا
دھبے کے۔ بھیا آج مجھے دیکھیں تو کیا کہیں۔ میرے نصیب کے لکھے پر اتنی سیاہی ہے کہ سارے صفحے
پر ایک بھی تو سیدھی لائن دکھائی نہیں پڑتی۔ مجھے تو کبھی لکھنا نہ آیا۔

اُن دنوں گڑیا گھر سجا کر میں سوچا کرتی تھی کہ ہم اس میں رہ سکتے ہیں۔ آماں اور بابا اور میں
بھیا اور بھائی اور آپا بھی بس یہاں رہیں گے۔ زندگی رس بھرا گیت ہے۔ کسی شے کی ضرورت نہیں
کوئی کمی نہیں۔

بھیا کی شادی ہوئی تو میں نے کہا تھا۔ ہمارا گھر جنّت ہے۔ مکمل اور آسمانی جنّت۔ اُن دنوں میں
اگر دُعا مانگنے کے لئے ہاتھ اُٹھاتی تو سمجھ ہی نہ سکتی کہ کیا چاہوں۔ آج کی طرح اُن دنوں بھی میں نے
خدا سے کچھ نہیں مانگا۔ سُکھ اور دُکھ کی انتہا زندگی کے چکّر میں ایک ہی مقام پر ہے۔

بھائی سمندر پار چلے گئے، اور میرے جنّت کے خواب چُور چُور ہو گئے۔ ساری زندگی کی کرچیں
نوکیلے کناروں والے کانچ کے ٹکڑوں کی طرح اِدھر اُدھر پھیل کر گزرنے والوں کو زخمی کر رہی ہیں۔ سب کے
پاؤں معذور ہو گئے ہیں۔ راہ کے دوسری طرف جانے والا کوئی بھی تو نہیں رہا۔ راستہ یوں سُونا ہے جیسے
شمشان میں سے ہو کر گزرتا ہو۔ دور دور تک کوئی نہیں۔ . . . . ولاپ کر اس دیس میں کون سُنتا
ہے۔ اکیلے پن کا دُکھ کتنا کٹھور ہے۔ زندگی کتنی مشکل ہے۔ گوپال دور کھڑا مجھے پکار رہا ہے۔ منّی کو پکار رہا ہے۔
ہم دونوں ہولے ہولے چل رہی ہیں۔ کپاس کے کھیتوں میں صرف سوکھی لکڑیاں کھڑی ہیں۔ ہنستے پھول
سمیٹ کر لوگ کھیتوں میں لے جاتے ہیں۔ گندم کے کھیتوں میں ابھی نہ بالیں پھوٹی ہیں۔ اور نہ ان میں دانے
پڑے ہیں، ہوا کے جھونکے نرم لچکیلے پودوں کو جھُکا لیتے ہیں۔ ہوا کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ ہر ایک

جھکنا ہے۔

بڑی ماں بہت بے چین ہو گی۔ میری طرف سے ایک انجانا خوف نہ جانے کیوں ہر وقت اُس کے کلیجے کو دھڑکاتا رہتا ہے۔ جس دیس کا وہ سوچتی ہے اُس کا راستہ کٹھن ہے اور میں گُرپال کے ساتھ جتنا راستہ چل کر آئی ہوں، اُس سے آگے چلنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ آخر کوئی کہاں تک چلتا جائے اور پھر جب کہیں جانا ہی نہ ہو۔ زخمی پاؤں اور زخمی دل کو لے کر اُجڑی مانگ کے ساتھ میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں۔ مُنّی میری راہ میں کھڑی ہے، مُنّی میرے اور اُن کے درمیان اُوٹ ہے۔ کتنے فاصلے میرے اور ان کے درمیان ہیں۔ بھلا میں اس سے پرے کیسے جھانک سکتی ہوں؟

گانے والوں کی ٹولیاں بھجن گاتے پیچھے آ رہی ہیں۔ اچل کے تالاب میں جما ہوا میلہ اب بٹ کر بیل گراہوں میں بکھر آیا ہے۔ بچّے روتے جاتے ہیں۔ مرد زور زور سے باتیں کرتے ہوئے میرے اور مُنّی کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ عورتیں اچھے اچھے کپڑے پہنے دوپٹوں کو سنبھالتی۔ ذرا ذرا سے گھونگھٹ ہاتھوں تک سرکائے، میلے میں خریدی مٹھائیوں کی پوٹلیاں ہاتھوں میں جکڑے، بچّوں کو کندھے سے چمٹائے، ننگے پاؤں تیز تیز چل رہی ہیں۔ ان کے جوتے دوپٹوں کے پلوؤں میں بندھے ان کے پیچھے جھول رہے ہیں۔ زمین اور جسم کا گہرا رشتہ ہے۔ اس کے اور انسان کے درمیان کوئی پردہ کیوں ہو۔

دور ہٹتے لوگ سفید دھبّے لگ رہے ہیں۔ اکتارہ بجاتا ایک سادھو سنگراؤں جانے والی راہ پر ہمارے پیچھے مڑ گیا ہے۔ اس کی آواز میں کتنا درد ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے جب روشنی کا کوئی وجود نہ ہو اُس کے بعد بھی روشنی کی تمنّا باقی رہتی ہے۔ اُس کے تاروں کی جھنکار مجھے سُنائی نہیں دیتی، صرف گیت کے بول ہوا کے ساتھ کبھی کبھار میرے کانوں میں پڑ جاتے ہیں۔

"ماں! تم چپ کیوں ہو؟ کوئی بات کرو مجھے ڈر لگتا ہے"۔ مُنّی بڑھتے اندھیرے میں میرے ہاتھ کو اور زور سے پکڑنے کی کوشش میں اپنی گڑیا کو سنبھال نہیں سکتی۔ اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ رہی ہے۔ اُسے کوئی اور سوال پوچھنے کا ہوش نہیں۔

مُنّی کو بھی بڑے ہونے پر آپ سے آپ پتہ چل جائے گا کہ اندھیرے سے ڈرنا بے کار ہے۔ جب اس کا جادو چل جاتا ہے پھر کچھ کئے نہیں بنتا۔ بھائی کہا کرتے تھے "بی بی پانی میں زور ہے اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے"۔ مجھے ان دنوں میں یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ پانی میں زور کہاں سے آتا ہے۔ حالات کا دھارا راستے خود پیدا کر لیتا ہے۔ بڑی ماں جب مجھے پکارتی ہیں تو میں پھلکاری کو ماتھے تک سرکائے ہولے سے "جی" کہتی ہوں۔ ہر کام کو اتنی جلدی نبٹانے کی کوشش کرتی ہوں کہ مصروف

رہوں اور اپنے ساتھ اکیلے ہونے، سوچنے بچارنے کا وقت نہ مل سکے۔

جب تھکے تھا تو سوچ نہ تھی۔ اب سوچ ہے تو سے نہیں۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ یہ کمی کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کبھی کچھ نہیں ہوتا اور کبھی کچھ۔ آج آنکھیں بند کرتی ہوں تو دل کہتا ہے وہ سب ابھی آئینگے اور بھیا مجھے دیکھتے ہی کہیں گے "بی بی یہ کیا بہروپ ہے۔ پھلکاری تمھارے سر پہ ذرا اچھی نہیں لگتی۔ اتار اس کو پرے کر۔ یہ دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں۔ چھوڑدے سارے کام اِدھر ہمارے پاس بیٹھ چھٹیاں کم ہوتی ہیں اور پھر گزرتی کتنی تیزی سے جاتی ہیں۔ جب ہم گھر آیا کریں تو کہیں بھی جایا نہ کر۔"

بڑے کمرے میں صوفوں پر بیٹھے تصویروں کی طرف دیکھتے، باتیں کرتے چائے پیتے، آتش دان کے سامنے آگ تاپتے۔ جب ہم زور زور سے قہقہے لگاتے تو اماں سوئی ہوئی آواز میں کہتیں "صبح بھی اٹھنا ہے اب سو جاؤ بچو!" تو بھیا زور سے پکار کر جواب دیتے۔" اماں گھر سے دور ہی تو رہتے ہیں۔ سارا سال اداس ہو کر سویا کرتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے سو ہی جائیں گے اماں!" اور میں سوچا کرتی تھی۔ جوابوں کی طرح ساری باتیں دھول میں مل جائیں گی۔ محبت کے سہارے جو جنت آباد کی ہے اس پر اس طرح گرد و غبار چھا جائے گا کہ کہیں بھی شادابی نظر نہیں آئے گی۔ ہم تصویروں کی طرح حقیقت کی پرچھائیں ہیں۔ میرا دل تو سدا سے باؤلا تھا اُلٹی باتیں سوچنے والا اور بڑا ہی مورکھ۔

دل سدا سے انہونی باتوں کے سپنے دیکھتا اور یوں ہی دھڑکتا ہے۔ جب اس سے بات کرتی ہوں تو کہتا ہے۔" آخر تیرا کیا جاتا ہے بی بی! سپنوں پر تو کسی کا اختیار نہیں اور پھر اس سپنے میں کیا بُرائی ہے کہ کھلے کواڑوں کے اندر کسی دن وہ سب آجائیں جن کا تمھیں انتظار ہے۔

میں کہتی ہوں "میرے لئے سوائے اندھکار کے کچھ باقی نہیں رہا"۔

دل کہتا ہے۔" نا اُمید ہونا بہت بڑا پاپ ہے"۔ پر اُمید آخر کس شئے کی کروں؟

مُنّی میرا آنچل پکڑے پوچھ رہی ہے۔" ماں بتا ہمارے ماما ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟ کیا دیوالی میں ہم ماما کے پاس نہیں جائیں گے ماں۔ ساری لڑکیاں ہی تو جا رہی ہیں۔ ماں میرا دل اب اں گاؤں میں نہیں لگتا۔ میرا دل میلے میں بھی نہیں لگا۔ بس میرا جی تو اداس ہے۔ میں ماما کے گھر جاؤں گی"۔ کس سے پوچھوں، اس کے ماما کا گھر کس نگر میں ہے۔ سنگراؤں سے باہر گاؤں مجھے گڑیا گھر لگتے ہیں جنکی کوئی اصلیت نہیں۔ سنگراؤں بھی پرچھائیں ہے۔

اور پھر نہ جانے کیوں آتما بھٹکتی ہی رہتی ہے۔ ایسی چیزوں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے جو کہیں

بھی نہ تھیں۔ ایسی آوازوں کو سُننے کی آشائیں جو پھر کبھی سُنائی نہ دیں گی۔ سر پر گوبر کے ٹوکرے اُٹھاتے اُٹھاتے، دودھ دوہتے، اوپلے تاپتے نہ جانے کیوں چند مہینوں سے میرا دل دھڑکا کرتا تھا۔ ہوا میں اچانک جانی بوجھی خوشبو ہوتی اور مجھے سارے باجوں کے سُر اپنے قریب آتے جان پڑتے۔ مجھے اپنے سے دور لے جاتے ہوئے۔ پر اب مجھے معلوم ہے۔ جہاں وہ سب ہیں۔ وہ دیس میری پہنچ سے باہر ہے۔ سنگراؤں کو جانے والے راستوں کی طرح سارے لہراتے راستے ایک دوسرے کو کاٹتے گزرتے ہیں۔ کہانیوں کے اس شہر کا کھوج لگا کر میں کیا کروں گی۔

آباد گھروں کے کھلے کواڑوں سے اندر جلتے دیوں کی کانپتی روشنیاں پریوں کے دیس کی تصویر سی جان پڑتی ہیں۔ گرُپال اور لڑکے، ہیں اور مُنّی اب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ سرکنڈوں کے ریشمی بور میرے بالوں سے چھو رہے ہیں۔ ہوا اپنا ریشمی آنچل سنبھالے دھیرے دھیرے سونے لگی ہے۔

اکیلے سے دو ہوں تو راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

مُنّی کہتی ہے ”ماں میں تھک گئی ہوں۔ مجھ سے اب اور نہیں چلا جاتا“۔ لڑکے رو رہے ہیں۔ اور ان کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ اور اُن سے سنبھالے نہیں سنبھلتے ہم راہ سے ذرا ہٹ کر ایک کھیت کی اونچی منڈیر پر بیٹھ گئے ہیں۔ مُنّی نے میری گود میں اپنا سر رکھ لیا ہے۔ گرپال کہہ رہا ہے۔ ”دیکھو تو سہی، عورتیں کتنی بیوقوف ہیں، آج کتنے بچے گم ہو گئے ہیں۔ میلے میں انھیں ہوش ہی نہیں رہتا کہ سنبھال سکیں۔ پاگلوں کی طرح رام لیلا کی راس دیکھتے دیکھتے اپنے بچوں سے بچھڑ جاتی ہیں“۔

”میلے کے بنا بھی تو بچے ماؤں سے بچھڑ جاتے ہیں“ میں اس کی طرف دیکھے بنا مُنّی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہوں۔ ”گرپال

تم کبھی بھول بھی سکو گی اس بات کو کہ نہیں۔ وہ وقت اور تھا یہ اور ہے۔“ گرپال ہولے سے کہتا ہے۔

گرپال کو میں کیسے سمجھاؤں کہ وقت کبھی اور نہیں تھا۔ اور انسان کے نصیب میں دُکھ اسلئے ہے کہ وہ بھول نہیں سکتا۔ میری یاد میں وہ نظارہ اسی طرح زندہ ہے۔ ہر طرف آگ لگی تھی۔ ملک آزاد ہو گیا تھا۔ ملک بٹ گیا تھا۔ اماں اور بابا نے کہا کہ یہ سارے لوگ پاگل ہیں۔ جو ڈر رہے ہیں اور دوسرے دیس کو بھاگے جاتے ہیں۔ بھلا اتنے اپنوں کے درمیان بھی کبھی کسی کو کوئی دُکھ چھو سکتا ہے۔ اماں

اور بابا کتنے بھولے تھے۔ دُکھ تو سدا اپنوں ہی سے ملتے ہیں۔ اُس پریشانی کی کیا اصلیت ہے جو بیگانوں کے ہاتھوں ہمیں پہنچتی ہے۔ ساری زندگی نے اپنی خوبصورتی کھودی اور ہر شئے کا چہرہ خون کے غبار میں چھپ گیا۔ بھگوان۔ گرُو اور اللہ کے نام پر دان دینے والوں نے ایک دوسرے کے گلے پر تلواریں چلائیں۔ بہنوں، بیٹیوں کے لئے کٹ مرنے والے عورت کی عزت اور عصمت کو جھوٹا بول سمجھنے لگے۔ بھائی اور اپنوں کے لفظ صدیوں کی بیڑیوں کی طرح آزادی اور بٹوارے میں کٹ گئے اور جتھے بنا کر گھومنے والوں کے قدموں میں دھول بن کر مل گئے۔ اماں نے بابا سے کہا تھا "ہم بھی لڑکیوں کو لے کر چلتے ہیں۔ میرا جی تو ہول کھاتا ہے۔ اس وقت کسی پر بھروسہ کرنا بے کار ہے"۔

اور بابا نے اپنی اُسی طمانیت سے کہا تھا "بی بی کی اماں تم بھی عام لوگوں کی طرح ناحق جان گھُلاتی ہو۔ بھلا ہمیں بھی کوئی تکلیف ہو سکتی ہے۔ بٹوارے کے بنا چارہ نہ تھا۔ یہ شور تو چند دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ"۔

اماں عام زندگی میں تو ایسے جواب سے مطمئن ہو جایا کرتی تھیں پر اس دن نہ ہوئیں۔ بولیں "جان کے ساتھ عزت کا خطرہ ہے۔ جوان لڑکیوں کا ساتھ ہے۔ میری مانو ہم سب کو بھیا کے پاس بھیج دو"۔

بابا بولے "راہوں پر ہر طرف گاؤں کے آوارہ لوگ بھاگتے پھرتے ہیں۔ گاڑیوں کی گاڑیاں کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔ ایسے میں جانا اور بھی زیادہ خطرے کی بات ہے۔ بس تم خاموشی سے اپنے گھر میں رہو۔ خدا ہماری حفاظت کرے گا۔ بابا حالات کی وجہ سے پریشان ہوں گے مگر انھوں نے وقت کے گزرنے پر سوائے خدا کے بھروسے کے اور کسی کی مدد کا واسطہ ہمیں نہیں دیا۔ یوں وقت تو کب سے گزر چکا تھا۔ بابا کی بھول یہی تھی کہ انھوں نے پُرانی زندگی اور قدروں کا سہارا لیا تھا اور اسی بھول کے بدلے تو جب گرُپال مجھے گھسیٹ کر گھر سے باہر لا رہا تھا۔ میں نے بابا کے سفید سر کو نالی کے کنارے پڑا دیکھا۔ اُن کا جسم نالی میں تھا۔ بند آنکھوں اور خون آلود سر کو بھول کر وہ جانے کس طاقت سے پرارتھنا کر رہے تھے۔ دعا کے قبول ہونے کا وقت تھا بھلا؟ اماں کے سینے سے ایک چمکتا ہوا برچھا آر پار ہو گیا تھا اور وہ اُسی جگہ گر گئیں جہاں انھوں نے خدا سے اپنی حفاظت اور عزت کے محفوظ رہنے کی دعا مانگی تھی۔ آپا کی چیخیں آج بھی مجھے آندھی کے شور میں کبھی کبھار سُنائی دے جاتی ہیں۔ پر آج کی طرح تب بھی میں کیا کر سکتی تھی۔ گرُپال مجھے کھینچے لئے جا رہا تھا۔ میرے سر پر چُنری نہ تھی۔ پر مجھے ان راہوں پر بھیا کے ملنے کی آس کب تھی۔ اگر

بھیا میرے پاس ہوتے تو بھلا کوئی مجھے چھو سکتا، کوئی یوں ننگے سر مجھے جنم بھومی کی ان راہوں پر
گھسیٹ سکتا تھا، جہاں کا ہر ذرہ ہمیں پیارا تھا۔ ان راہوں پر میرے بابا کا خون گرا ہے۔ اس
دھول میں ان کا سفید سر گھسیٹا گیا تھا۔ وہ کون دیس ہے اگر اُس دھول کی ایک جھلک
دیکھ سکوں تو آج بھی اس کو ماتھے پر چڑھاؤں۔ وہ مٹی مجھ سے تو خوش قسمت ہے۔

مجھے اپنے بابا سے کتنی باتیں ابھی کرنا تھیں۔ اماں کو میں نے کتنا ستایا تھا۔ بھیا اور بھائی
کو کتنا تنگ کیا تھا اور جب میرا وجود ڈولی کے بِنا سنگراؤں تک کھینچا گیا تو کوئی ماں جایا نہیں
تھا جس سے رُو رُو کر التجا کرتی کہ بابل کا دیس چھوٹ رہا تھا اور کوئی مجھے وداع نہیں کر رہا تھا۔
دُکھ سہنے کے بعد اگر سُکھ کی آس ہو۔ دور کوئی اُمید ہو تو دُکھ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور
میرا راستہ کبھی نہ کٹ سکا کیا بھولوں اور کیا یاد کروں گرپال۔ تم نے تو کبھی مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے ہی
نہیں دیا۔

بڑی ماں کی مار، گرپال کی گالیاں، بھوک کی سختیاں میں نے دُور ٹمٹماتے دیئے کی طرح اُس
آس کی طرف دیکھ کر برداشت کر لی تھیں کہ شاید بھائی اور بھیا مجھے کھوجتے ہوئے کسی دن سنگراؤں
میں آجائیں۔ پھر میں بڑی ماں کی طرف دیکھ کر مسکرادوں گی اور گرپال کی طرف دیکھے بنا اپنے
بھیا کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اس دن نیم کے پتّوں میں کھیلتی ہوا گیت گائے گی اور سارے
گاؤں میں خوشیاں ہوں گی۔ انسان اپنے کو ساری کائنات کا مرکز کیوں سمجھتا ہے نہ جانے کیوں۔
جب تک اندھیرے سے آنکھیں مانوس نہیں ہوتیں انسان اُجالے کے لئے آنکھیں جھپکاتا رہتا ہے
اور سپنے دیکھتا رہتا ہے۔ اُمیدیں آوارہ خیالوں کی طرح دل کے گرد چکر لگاتی رہتی ہیں۔ مُنّی پیدا
ہوئی ہے تو میرے سپنے کی کڑیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ دل کے گرد آشاؤں کا گھیرا بکھر گیا۔ میں نے
سپنوں میں جاگنا شروع کیا سنگراؤں کے گیتوں میں کبھی کبھار میرا ایک بول بھی گونج اُٹھتا۔
جب دونوں ملکوں میں صلح ہوئی تو گرپال بہت اُداس رہتا۔ سہما سہما اور پریشان،
بڑی ماں اور وہ چوکے میں بیٹھے ہولے ہولے جانے کیا باتیں کیا کرتے۔ پر مجھ سے دونوں کچھ نہ کہتے۔ ان
دنوں مُنّی پاؤں پاؤں چلتی تھی اور توتلی باتیں کرتی تھی۔ خبریں زور شور سے گونجتی رہیں اور پھر
بگولے کی طرح بیٹھ گئیں۔ مجھے کوئی فوج لینے نہ آئی۔

پھر میں نے سُنا پاس کے گاؤں سے دوسرے ملک کے سپاہی لڑکیوں کو ڈھونڈ کر لئے جا رہے
ہیں کس دیس کو؟ آخر کہاں؟ کن لوگوں کے درمیان؟ ان دنوں میں نے بھی سوچا تھا۔ شاید بھیا
اور بھائی بھی مجھے ڈھونڈنے آئیں گے۔ جادو کے شہر کے دروازوں کے باہر وہ کب سے میری راہ دیکھ

رہے ہوں گے۔ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے جانا چاہئے ضرور۔ میں ہر روز اپنی اُمیدوں کی پوٹلی کی گرہیں باندھتی اور آس لگائے گلی کے موڑ کی طرف دیکھتی رہتی۔

اُس سال سردیوں میں ہمارے سنگراؤں میں سپاہی مجھے لینے آئے۔ میں بھیّا اور بھائی کی بی بی ہونے کے ساتھ ساتھ مُنّی کی ماں بھی ہوں اور میں نے سوچا جانے یہ کون لوگ ہیں۔ وہ کون دیس ہو۔ زندگی میں پہلی بار میرا یقین ڈگمگایا۔ سپنوں کا شہر دھول بن کر میرے سامنے سے ہٹ گیا۔ میری جڑیں سنگراؤں کی زمین میں گہری ہو گئی ہیں۔ سوکھنا، مرجھانا اور برباد ہونا کسے اچھا لگتا ہے۔ ہر کسی لڑکی کو مائکے سے وداع ہو کر سسرال جانا ہوتا ہے۔ ہر دلھن بیاہ کر کہیں نہ کہیں جاتی ہے۔ میرے بیاہ میں بھیّا اور بھائی نہ ملے تو کیا ہوا۔ گرپال نے میرے لئے لاشوں کا فرش بچھایا تھا۔ خون سے راہیں سُرخ کی تھیں۔ شہروں کے شہر جلا کر روشنیاں کی تھیں۔ لوگ چیختے چلاتے، بھاگتے میری شادی کی خوشیاں منا رہے تھے۔ ساری فضا میں بدلے رواجوں کے مطابق دھوئیں اور آگ اور خون کی بُو تھی مجھے وہ سنگراؤں لایا تھا۔ یہاں گندم کے کھیتوں کے درمیان کچّے گھر کی کوٹھری میں میری باقی زندگی بیتنے والی تھی۔ اُپلے کے نیلے دھوئیں سے بھرے گھر میں۔

میں کتنی دیر اس کتاب کے حرفوں کو دیکھتی رہی تھی جو گرپال اتنے برسوں کے بعد مُنّی کو پڑھانے کے لئے لایا تھا اور لفظ میری آنکھوں میں دھڑکن بن گئے تھے۔ مجھے وہ ساری کہانیاں یاد آ گئی تھیں جو بھیّا اور بھائی نے مجھے سُنائی تھیں اور پھر کہا تھا "بی بی اس سے بھی اچھی کہانیاں کتابوں میں ہیں۔ بس ذرا بڑی ہو جا پھر دیکھنا کتنے مزے کی باتیں پڑھے گی۔ کہانیوں کی شہزادی کی طرح جب فوج مجھے چھڑانے آئی ہے تو میں چھپ گئی۔ میں کسی اور کے ساتھ کیوں جاتی بھلا۔ مجھے رلوانے اور وداع کرانے بھیّا اور بھائی کیوں نہیں آئے۔ میں دل ہی دل میں بھیّا اور بھائی سے روٹھ گئی۔ میں اُن سے آج تک خفا ہوں۔

مُنّی جب پاس لیٹتی ہے تو مجھ سے پوچھتی ہے "ماں تم دیوالی میں بھی ماما کے گھر کیوں نہیں جاتیں؟ ماں ہمیں کبھی کوئی مٹھائی کیوں نہیں بھیجتا؟"

ماما کبھی کھوجنے ہی نہیں نکلے مُنّی۔ تیرے ماما مجھے کبھی وداع کرانے نہیں آئے۔ بھلا زندگی میں کسے اتنی فرصت ہوتی ہے کہ کسی کو ڈھونڈتا پھرے۔ ہولے ہولے محبّتیں سارے سہارے ڈھونڈھ لیتی ہیں۔ بھیّا کے بچّے اب مُنّی کے برابر بڑے ہوں گے۔ وہ جب اپنی ماں سے ماما کے گھر کی باتیں پوچھتے ہوں گے تو اُسے چُپ رہ کر یا دھیان ہٹانے کے لئے اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں کرنی پڑتی ہوں گی۔

کبھی کبھار دل میں کہانیاں ہوتی ہیں پر زبان پر ایک لفظ نہیں آتا۔ گلی کی بہوئیں جب نیم کی چھاؤں میں چرخے کاتتی گیت گاتی ہیں تو میں چپ رہتی ہوں۔ ہمارے آنگن میں کتنی رونق ہوتی ہے۔ مائکے کے گیتوں میں کتنا رس ہے۔ رُتیں بدلتی ہیں۔ سال بہ سال کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو ان کے باپ بھائی وداع کرانے آتے ہیں۔ تب آشا، دیکھا، پدرا اور چندر کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ وہ ہر ایک کے گلے مل کر مائکے جاتی ہیں۔ اُن کے بول گیت لگتے ہیں۔ رُتیں بدلتی رہتی ہیں۔

لڑکیاں کوّے کو چھت سے اُڑا کر اپنے ویروں کے آنے کا پوچھتی ہیں۔ میرا دل گلے کے قریب یوں ہی دھڑکنے لگتا ہے اور کلیجے کے قریب ایک نس ایسی بھڑکتی ہے کہ مانو پھٹ جائے گی۔ میں کوّے کو اُڑانے کے لئے ہاتھ اُٹھاؤں تو بے جان ہو کر وہ میرے پہلو میں گر جاتا ہے۔

بڑی ماں کو مجھ سے آس بندھ گئی۔ جب میں نے اپنی پچھلی زندگی سے سارے ناتے توڑ لئے تو میرا اور بڑی ماں کا ناتا اور گہرا ہو گیا۔ میں اس کی لکشمی بہو بن گئی ہوں۔ میرے ہاتھ کا سُوت وہ بڑے چاؤ سے لوگوں کو دکھاتی ہے۔ اور دوسری عورتیں جب اس سے اپنی بہوؤں کے گلے کرتی ہیں تو وہ میری باتیں کر کے اُن کا دل اور بھی جلاتی ہے۔

کھیتوں میں گھومتی اناج کی خوشبو اور سبز گندم کی بالوں کی باس دور تک پھیلے نیلے دھوئیں میں مل کر ایک گیت بن جائے۔ اُن پر جھکا آکاش اور نہر کا ننھی منی لہروں میں بھرتا آکے دُکے ناروں سے بل کھاتا پانی سب اُس کے بول ہوں۔ اگر بیلوں کے لئے سر پر چارے کے گٹھے اٹھائے کسانوں کے پیچھے کسی دن گھوڑے پر سوار ایک جوان میرے کھلے کواڑوں کے سامنے آن کر اُترے اور میں "بھیا" کہہ کر اس سے لپٹ جاؤں۔ میں دروازے پر کھڑی کھڑی بھلا کس کی راہ تکا کرتی ہوں۔ آشاؤں کے مرنے کے بعد اُن کی لاشوں کو اُٹھائے مجھے کب تک گھومنا ہو گا؟ ان اینچ پیچ راہوں کو دیکھتے دیکھتے آنسو آپ سے آپ میری آنکھوں میں کیوں آ گئے ہیں۔ منّی کے سر پر اگر یہ آنسو گر گئے تو وہ گھبرا کر اُٹھے گی اور پوچھے گی "ماں تم روتی کیوں ہو؟" میں اس سے اپنا دُکھ کیسے کہوں؟

مُنّی اگر پوچھے "ماں تمھاری آنکھیں بھیگی ہوئی کیوں ہیں۔ تم دسہرے کی رات بھی روتی ہو ماں۔ کیا تم تھک گئی ہو؟"

گوپال نے دونوں بچوں کو کندھے پر اُٹھا لیا ہے۔ منّی اور میں سنگراؤں جا رہے ہیں۔ میں نے ــــــ بن باس پر جانے کے بدلے گوپال کے گھر منّی سمیت قبول کر لیا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئے گی کہ میں دوسری بار کسی بے یقینی کا سہارا لے کر اندھیکار سے باہر قدم دھر سکوں۔

زندگی کی ساری روشنیاں پیچھے شہر کی طرح مجھ سے دور ہٹ گئی ہیں مگر مجھے پھر بھی اس

اندھیرے سے پیار نہیں ہو پاتا نہ جانے کیوں ؟
مجھے چلتے ہی جانا ہے۔ تھکن میرے انگ انگ میں دُکھن بن کر پھیلی ہے۔ پر پھر بھی مجھے چلتے ہی جانا ہے۔ زندگی کے میلے میں باسی اور بن باسی سب قدم بڑھائے چلنے پر مجبور ہیں اور میں قدم بڑھاتی سوچتی ہی رہتی ہوں۔ کبھی بھائی اور بھیا بھی میرے لئے اداس ہوتے ہوں گے ؟
سب سے زیادہ ڈر تو مجھے مُنّی سے لگتا ہے۔ وہ پھر کل مجھ سے یہ سوال پوچھے گی۔ اور پھر کوئی بھی اس کی بات کا جواب نہیں دے سکے گا۔ نہ گوپال اور نہ میں اور نہ شاید بڑی ماں۔
کبھی سوال ایسے کیوں ہوتے ہیں۔ اتنے کٹھن اور ایسے مشکل جن کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکے۔
سردیوں کی لمبی راتوں میں دُکھ الاؤ جلا کر، بیتے سپنوں کو بلاتا اور کہانیاں سُناتا ہے۔ کہانیاں بھلا سچی ہو سکتی ہیں۔ من بڑا ہٹیلا ہے۔ اسے بیتے دن نہ جانے کیوں یاد آتے ہیں ؟
سنگرادس کے پرے بھی کوئی نگر ہے کیا ؟
گاؤں کی اونچی نیچی گلیوں میں گوبر اور موت کی باس اناج کی باس کے ساتھ مل زندگی کے دھارے کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔
آج کا دن بھی ختم ہو گیا۔ ہوا کے جھونکوں کی طرح دن ختم ہو جانے ہیں۔ جانے ابھی کتنا راستہ باقی ہے ؟

نادر کتب
نگاتِ مجنوں
تنقیدی حاشیئے اور کچھ نئے مضامین -/5
مجنوں گورکھپوری
تحقیق و تنقید
کچھ نئے مضامین اور "تنقید جدید" اور "تحقیق و تنقید" کے بیشتر مضامین کا یکجا ایڈیشن۔ اختر اورینوی
3/75
تنقید و تجزیہ
اردو میں قصیدہ نگاری کے بعد دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔
ابو محمد سحر -/3
نئے ادبی رجحانات!
ترمیم شدہ پانچواں ایڈیشن جس میں اس بار دو نئے مضامین "پیروڈی اور رپوتاژ" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین 3/75
ضدی
عصمت کا مشہور ناولٹ جو فلمایا بھی جا چکا ہے۔
عصمت چغتائی 2/50
چار دل چار راہیں
خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول جو فلمایا بھی جا چکا ہے۔
خواجہ احمد عباس 3/50
گاندھی نامہ
چار جلدوں پر مشتمل کلیات اکبر کے بعد یہ پانچواں مجموعہ۔
اکبر الہ آبادی 2/50
کتابستان الہ آباد ۲

ASANA (URDU MONTHLY) VOL. I—III
LLAHABAD. Price ·75 P. Regd. No. L—420
egistered with the Registrar of Newspapers for India at No. 9775/64

ver : Bhargava Press, Alld.